

$$\begin{array}{r} 537 \\ \times 119 \\ \hline 52993 \checkmark \\ 5370 \checkmark \\ \hline 63903 \checkmark \end{array}$$

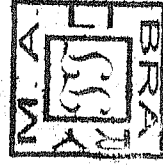
1807

M.A. LIBRARY, A.M.U.



U3210

مصوّر علیہ الرحمۃ



مصوّر غم حضرت علامہ دانشمند الخیری دھند انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کی
شاہجہاں آباد کے اس ممتاز اور نفاذان کے فرزند پریشد تھے جسے خاندان شامان خلیفہ کے اُستاد
ہونے کا نسل ابداً نسل آخر حاصل رہا۔ جس نے مولوی عبدالحق صاحب مرحوم مولوی عبد القادر
صاحب مرحوم اور ہندوستان کے مشہور سحرالبیان مولوی عبد الوہاب مغفور بانی جامع مسجد
سہارنپور جیسے جید علماء اور قرآن و حدیث کے نامور ماہرین پیدا کئے۔ یہ اُچھے دیار کا وہ
وہ نامور خاندان تھا جس کی بیٹیاں حافظہ، حاجیہ قاریہ ام عطیۃ النساء مرحومہ دیکھتی
اُستانی جی، اور حاجیہ ام دکھیہ مرحومہ جیسی مشہور عالمہ فاضلہ خواتین اور جس کے دادا
شمس العلماء مولوی نذیر حسین مرحوم محدث دہلی، اور شمس العلماء مولوی نذیر احمد
مرحوم جیسے نامور بزرگ تھے۔ حضرت علامہ مغفور، تمام دہلی جنوری ۱۳۵۷ء میں پیدا ہوئے،
اور ابھی نو دس برس ہی کے تھے کہ انکے والد ماجد مولوی حافظ عبد الوہاب صاحب نے
حیدرآباد دکن میں جہاں وہ محکمہ بندوبست میں افسر اعلیٰ تھے، انتقال فرمایا، اور حضرت
علامہ مرحوم کی تعلیم و تربیت ان کے دادا اور چچا حضرت مولوی عبد القادر صاحب مرحوم
اور خان بہادر مولوی عبدالحامد صاحب مرحوم ڈپٹی کلکٹر کی نگرانی میں ہونے لگی۔
یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی تعلیم کو مسلمان کفر سمجھ رہے تھے اس لئے حضرت علامہ مغفور
نے اردو فارسی عربی وغیرہ گھر پر پڑھی پھر انگریزی تعلیم دہلی کے عربک اسکول میں ہوئی۔ مگر
انھوں نے اپنے شوق سے اسے بہت کچھ ترقی دی مولوی نذیر احمد مرحوم دہو علامہ مرحوم
کے حقیقی پھوپھا تھے، اور مولانا حالی مرحوم کی شاگردی نے علامہ مغفور کی قابلیت کی
ترقی میں چار چاند لگا دیئے۔ انھی حضرت علامہ انٹرنس ہی میں تھے کہ انکی ذہانت کا چرچا ہونے لگا
تکمیل تعلیم کے بعد مولوی عبد الرحیم صاحب بانی جامع مسجد جھجھر کی اکلوتی صاحبزادی
سے جنوری ۱۳۵۷ء میں شادی ہوئی۔ اور ۱۳۵۸ء میں محکمہ بندوبست کے انگریزی دفتر میں ملازمت
شروع کی مگر ملازمت کی پابندی حضرت علامہ کی طبیعت کے خلاف تھی۔ اور دفتر کے شک
کاؤں میں جی دگلتا۔ پھر علامہ مرحوم کی والدہ مرحومہ اپنے اکلوتے بیٹے کی جدائی زیادہ روز

خانگی زندگی انتہائی کامیاب تھی اور دیکھنے والوں کے لئے ہر حیثیت سے قابل رشک تھی بے نظیر بیٹے، لا جواب بھائی، سعادت مند داماد بے مثل شوہر، عاشق زار باپ، اور بہترین دوست ہمیشہ شاداں و خنداں رہتے تھے۔ ان کی بذلہ سخی، لطیف گوئی اور زندہ دلی ان کے ملنے والے بھلائے سے بھی نہیں بھول سکتے۔ جن کی قابلیت کا چار کھونٹ ڈنکا بج رہا تھا جن کی شہرت اس دور کے بڑے بڑے مصنفوں اور ہنماؤں کے لئے باعث رشک تھی، جن کا نام عزت کے ساتھ جن کا ذکر محبت کے ساتھ کیا جانا تھا، ان کی شرافت اور اخلاق، سادگی اور وضع داری، ہمارا نوازی اور انسانی ہمدردی دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتی تھی۔ ان کی عاجزی اور انکساری کا یہی ثبوت کچھ معمولی نہیں کہ ۶۰ کے قریب کتابیں زندگی میں شائع ہوئیں لیکن کسی کتاب میں تصویر شائع نہ کرنے دی کسی کتاب کو کسی کے نام منسوب نہ کیا۔ کسی کتاب میں کسی کی تقریظ جائز نہ سمجھی۔ تین چار کتابوں میں دیباچے بھی مجبوراً لکھے۔ ورنہ سوائے ٹائٹل پر نام آنے کے اپنا نام تک اپنی کتاب میں دو بارہ آنا پسند نہ فرمایا۔ صبر و شکر توکل و قناعت ہمیشہ شیوہ رہا۔ اپنی حالت میں بے انتہا خوش رہے۔ رحمہ علیہ مخلصانہ علی ہمدردی غفروں کی آگ میں کو دھڑنا۔ دوسروں کے لئے سب کچھ لٹا دینا المختصر خدمت خالق اللہ حاصل عرفاً ۶۷ سال کی عمر اور نظائر صحت نہایت اچھی کہ دو ماہ بیمار رہ کر فروری کی مغویں صبح کو اچھے دیا رکے آخری ماہ مصنف کا سایہ قوم بدرجہت کے سرسے اٹھ گیا۔ مصور غم کی رحلت پر ہندوستان بھر کے ہر پڑھے لکھے گھرانے میں گھر امچ گیا جگہ جگہ زمانہ اور مردانہ ماتی جیسے ہوئے اور ہندوستان کے باہر ادب اردو ذوق رکھنے والا ہر شخص دم بخود ہو گیا۔ جس قدر رنج و غم میں ڈوبے ہوئے مضامین جلتے مرنے لگے۔ طبعیات تاریخ المختصر جس قدر بلند پایہ ماثی لکھ کر مصور غم کے انتقال پر شائع ہو گیا وہ اتنا زبردست کہ بقول ایڈیٹر ملت "کسی ادیب یا رہنما کی وفات پر اس وقت تک شائع نہ ہو سکا، آسمان کتنی ہل سکر واپس پڑے زمین کتنی ہی چکر کاٹے۔ ہندوستان بدلے ہندوستان والے بدلیں، معاشرت بدلے ادب بدلے، لیکن مصور غم حضرت علامہ دانش لکھنوی کو ہمیشہ عزت و محبت کے ساتھ یاد کیا جا اور ان کا نام آئیو الی نہیں فخر کے ساتھ لیتی رہیں گی۔ خدا کی بے شمار رحمتوں کے بھول اس فراہما پر برستے رہیں جس میں وہ میٹھی نیند سو رہے ہیں اور خدا جنت نعیم میں اس پاک روح کو ابدی سکون عطا فرمائے۔ جس کی دائمی مغافرت ہیں آٹھ آٹھ آنسو لاری ہے۔

رازق الخیری

۲۲ جولائی ۱۳۶۷ء



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

۲۲۱

نسبہ کی رحلت معمولی موت نہیں ایک قیامت تھی جس سے ہر ہیریں
 ٹہرام مچا دیا۔ اس کا دم مجموعہ کرم تھا، اس کی ہستی بے کسوں کی بستی تھی۔ اس کا سایہ
 منوں کا بھایہ تھا خبر موت جس نے سُنی، جس حال میں سُنی، اور جہاں سُنی، ہائے
 فرکے رہ گیا۔ عورتوں کا ہجوم دو پہر تک اتنا تھا کہ نل دھڑے کو جگہ نہ تھی خلقت
 اس کی منیت پر پروانوں کی طرح گری۔ یتیموں نے سر پھوڑے، رانڈوں نے
 پھاڑیں کھائیں، مظلوم قربان اور لاچار نثار ہوئے۔ تسنیم ٹکٹکی باندھے
 کا جنازہ دیکھ رہی تھی کلیجہ پر گلوں سے مارتی تھی۔ مگر آنکھ سے آنسو نہ نکلتا تھا
 بھٹا کچھ خیال آیا، ایک چنچ ماری۔ اور یہ کہتی ہوئی اُٹھی "یتیموں کی ماں تسنیم
 کیونیم نہ کر، قدموں میں گری، پاؤں چومے اور پھر خاموش کھڑی ہو گئی۔ ڈولی
 ڈولی اُتر اور برقع پر برقع آ رہا تھا کہ سنجیدہ کی آمد کا غلغلہ ہوا، ستو
 دس سے اوپر عمر، حواس درست نہ مغل ٹھکانے۔ چلنے کے قابل نہ پھر نے
 لے لائق۔ قسیم گود میں اُتار کر لایا۔ اور زندہ پھوپھی کو مردہ بھتیجی کے
 بلو میں بٹھا دیا۔

سجیدہ صبر سے کام لیتی اتری، اور شکر کو ساتھ لیتی بیٹھی سبے حواس تھی۔ مگر ضبط پاس تھا، عقل زائل، خود گھائل، دل قاش قاش، کلیجہ پاش پاش، سنبھلی ہوئی دل کا حال جو کچھ تھا، اندر جیسی کچھ گزر رہی تھی، مگر زبان اور آنکھیں دونوں خاموش گو وقت نے دماغ کو جس نے کش مکش حیات کی پیچیدہ سے پیچیدہ گتھیاں دن رات سلجھائیں، قریب قریب ہیکار کر دیا مگر ضرورت کے لحاظ سے مصلحت کے اعتبار سے، لب پر مات اور زبان پر آہ نہ تھی، ادھر ادھر دیکھ کر نظر اُس نشے پر پڑی، جو نسیم کا جسد خاکی تھا، ہاتھوں نے جس جسم کو راتوں رات کے جوش میں ٹولا اُس وقت اس کو نگاہ نے سر سے پاؤں تک پرکھا، اور دل نے بے پردہ صدا دی، کہ مینا آرگئی، پیچرہ موجود ہے بلبل خوش الحان چل دی اور قفس خاکی رہ گیا۔ اس جسم کو بڑی بڑی اسیدوں اربانوں اور آرزوؤں سے پالا پوسا تھا، آج وہ تمام آسنگیں ختم ہوئیں، اس وقت آنکھ کے سامنے دوسرا منظر تھا، دماغ نے انتہائی اضطراب میں وہ سماں دکھا دیا کہ دوبرس کی جان پھوپی کے کلیجے سے چمٹی پڑی ہے، گھر میں حصّہ آیا محسّی، ترپنی، لوٹی، مگر ایک تھوڑا سا نصیب نہ ہوا، پٹخیاں کھاتی سو گئی۔ اس خیال کے آتے ہی جب یقین ہوا کہ اب تربیت اور استحباب ختم ہوئی تو بیتاب ہو کر ہاتھ بڑھایا۔ منہ سے کپڑا اٹھا کر دیکھا، تو کلیجے کا ٹکڑا خاموش پڑا تھا، ٹھکی اُس کے منہ پر منہ رکھا، ہٹی، پھر صورت دیکھی۔ ٹھکی، پاس آئی، اُس کے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ اور کہا ”اس چاند سے چہرے“ اس پھول سے جسم کو مارنے والی معافی کی خواہش نکلا رہے۔ بار بار ہے۔ پیٹا ہے، ڈنٹا ہے، ڈپٹا ہے مگر تربیت کا تقاضا، اور پرورش کی ضرورت تھی، میری سختی عداوت نہیں شفقت اور زیادتی نہیں محبت تھی پھر بھی تیرے بچوں کے سامنے تیرے شوہر کے

روبرو التجا کرتی ہوں، آئے نسیمہ! مجھے معاف کھیو!

اتنے کتنے بچیدار نے سامنے دیکھا، اور تسنیم سے کہا، "ہاں بی بی کپڑے تیار کر دیو وہاں کے واسطے دلہن بنانے والے ہاتھ آج قبر کے لئے دلہن بنائیں گے عطر لگانے والی میں تھی، کافر ملنے والی بھی میں ہوں گی لاؤ میری مینا کا جوڑا دو۔ چوتھی کے جوڑے میں میں شریک تھی۔ کفن میں بھی اپنے ہاتھ سے ایک ٹالکا لگا دوں۔"

اب بچیدار دیوانہ وار بھتیجی سے لپٹی۔ اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ ٹانگیں انتہائی جوش میں پورا کام کر رہی تھیں ہنسلانے والی عورت پانی اور سامان لئے بیٹھی تھی۔ اسے دیکھا اور کہا۔

"بی بی! ابھی نسیمہ کی ہنسلانے والی موجود ہے زندہ کی ہنسلانے والی میں تھی مردہ کو غسل بھی میں ہی دوں گی، میں نے اس جسم کی مدتوں سیوا کی، میں نے اس نام کی برسوں تنبیج رٹی۔ یہ بیج میرے سامنے پھلا پھولا مچھلایا، یہ کلی میرے ہاتھوں میں کھلی، ہنسی اور اُڑتی! نسیمہ میری گود میں کھیلی، بڑھی، اور مری۔ یہ تم کو مردہ مگر جھکو زندہ ہے، تمہارے ہاتھ سخت ہیں، تمہارا پانی تیز ہے، تمہاری روئی گرم ہے، ایسا نہ ہو کہ میری بچی کو اذیت ہو، لاؤ لوٹے بھر بھر کر دو، وداع عارضی میں ماں نے مدد دی۔ وداع حقیقی میں آتسنیم میرا ہاتھ بٹا۔"

تہذیب جدید نے اس قوم کے کان میں جو میدان ترقی میں سرپٹ دوڑ رہی ہے اور جس کا نام مسلمان ہے، یہ بھی پھونک دیا ہے کہ انسانی تعلقات صرف زندگی کے ساتھ ہیں اور جب امید حیات منقطع ہوتی تو واسطہ غلط اور تعلق فضول، اسی ابتدا کی انتہا، اسی آغاز کا انجام اور تہذیب کا نتیجہ ہے

کہ مسلمان غل اور کنہا خلافت تہذیب اور کبر شان سمجھنے لگے، منجید کا قدامت کی دلدادہ بھینچی کا مردہ نہلانے والی پریکیوں چھوڑتی، مردے کو زندوں کی طرح نہلایا، اور زرق برق کپڑے پہنانے والے ہاتھوں سے کفن پہنا خاتون بیٹھ گئی۔

باہر سے آواز آئی ”پردہ کر لو مرد اندر آتے ہیں“ اب منجید اُٹھی قسمیہ کو پاس بلا کر کہا۔

”خدا بچوں کی عمر دراز کرے، مگر میرا تمہارا رشتہ کل رات کو اس سگم کی موت ختم کر گئی۔ اب میرا تم پر کوئی حق اور زور نہیں میری بچی کے پچھلے حقوق اس وقت بد نصیب مامی تم سے سفارش کریں گے اور مجھے امید ہے کہ میری التجا بے کار نہ جائے گی۔“

مرنے والی نسیم جو بالکی میں بیٹھ تھارے ساتھ میری چوکھٹ سے دوا ہوئی جس نے دستور دنیا کے موافق مجھ کو دلایا۔ اور تم کو ہنسایا، اور جس کا جنازہ اس وقت میری اور تمہاری دونوں کی نگاہ کے سامنے ہے، تمہاری بیوی نہیں لونڈی۔ اور سگم نہیں کنیز تھی، دودھ کے دانت میری گود میں نکلے اور جوانی کے تمہارے گھر میں ٹوٹے پھٹیا گندہنے کے قابل میرے ہاں، اور سیاہی سفیدی سے تمہارے گھر میں بدلی، بچپن میری چوکھٹ پر ختم اور جوانی تمہاری دہلیز پر پوری ہوئی۔ میں جانتی ہوں، مزاج کی کڑوی اور تپے کی تیز تھی بیسیوں مرتبہ تمہارے حکم کی تعمیل میں انکار اور اپنی ناجائز ضد پر اصرار کیا ہوگا، مگر اب وہ باتیں ختم ہوئیں اور زمانہ گزر گیا، اب یہ وقت ہے کہ خدمت کا نسیم تمہارے گھر سے وداع ہوتی ہے۔ آج اُس کی بھلائی، بُرائی اس کی دوزخ جنت اس کا عذاب و ثواب تمہاری ذات پر منحصر ہے۔ اپنے بچوں کا

صدقہ میری بچہ کی خطائیں معاف کرنا۔ ناشاد نامراد بن نصیب و کجنت پھوپھی
تھی میں۔ جس کو یہ وقت دکھنا پڑا۔ خوش نصیب و باد مراد کامیاب و مبارک
تھی مرنے والی، کہ تمہارے ہاتھوں زمین کا پیوند ہوتی ہے۔ پاکلی آئی اور
چار پائی چلی!

یہ درخواست میرے پاس امانت ہے اور میرے اس خط کا جواب
ہے جو میں نے پلویں میں لکھا۔

یہ کہہ کر سنجیدہ نے نسیم کا خط نکالا اور نسیم سے کہا۔
”آسمان کی طرف مُنہ کر دو اور سچے دل سے اس کے تصور معاف کر کے
جنازہ اٹھاؤ“ قسیدہ مرد تھا، اور سنجیدہ سے زیادہ ضابط اور سنجیدہ مگر ساس
کی التجا نے کلیجے کے ٹکڑے اُڑا دیے، بے قرار ہو ہی رہا تھا اس وقت پلویں کی
تصویر آنکھ کے سامنے پھر گئی اور تمام باتیں جو وہاں ہوئی تھیں ایک ایک کر کے
یاد آ گئیں۔ نسیم کی موت، ماں کا صبر، اپنی بے دروی، ملبلا اٹھا اور یہ
کہہ ساس کے قدموں پر گرا۔

”مرنے والی نسیم دکھا گئی، کہ شریفیوں کی بی بیٹیاں ناموں کی لونڈی اور
کاموں کی بیگم ہیں۔ زندگی اس کے نام سے خوشی اس کے دم سے اور گھڑس
کے بھرم سے تھا، عورت کا راز اس کی ہستی میں اور ترقی کا بھید اس کی غنیمت
میں پنہاں اور پوشیدہ رہا، خوش نصیب تھی، یہ بیوی کہ اپنا جلوہ دکھا کر
مجھے یہ بتا گئی کہ مسلمان بیوی کیا معنی رکھتی ہے، رُوں گا، آج کیا عمر بھرا
آنکھیں ڈھونڈیں گی۔ اب کیا مدت العمر، لیکن نسیم وہ عورت تھی کہ میں
کیا اور چھوٹے بڑے سچے کیا، میرا محلہ، میرا خاندان، میرا شہر اس کو ہمیشہ ہمیشہ
روئے گا۔ قصود وار میں ہوں خطائیں مجھ سے ہوتیں۔ غلطیاں میں نے کیں۔

بچھڑوں کو ملانے والا جامع المتفرقین میرے الفاظ کا شاہد ہے کہ میں آپ کی بچی سے ناام ہوں اور اب صرف یہ آرزو ہے کہ موت یہ صورت پھر دکھا دے۔“

جنازہ اٹھا۔ توشے وغیرہ کی رسم جس کو پڑھے لکھے مسلمان بھی ضروری سمجھ رہے ہیں۔ سنجیدہ نے قطعاً آزادی میت کے آنکھ سے اوجھل ہوتے ہی اس نے کلام اللہ پڑھنا شروع کیا، اور جب یہ سنا کہ آنکھوں کی پتلی پیوند زمین کر دی گئی، تو سجدے میں گری۔ گڑ گڑائی، اور مغفرت کے لئے دعا مانگی۔

جسد خاکی کا پیش نظر رہنا تھوڑی دیر کا منظر تھا۔ جب نسیم ہزاروں مہن مٹی کے نیچے جا چھی، تو ایک دو یا دس بیس نہیں سینکڑوں بندگانِ خدا روتے بیٹھتے اپنے اپنے گھر رخصت ہوئے۔ اب نسیم اس دنیا میں نہ تھی، مگر اس کا نام زندہ، اور اس کے کام باقی تھے!

دفن کے بعد قسیم گھر لوٹا، اس کی حالت عجیب تھی، چاروں طرف نظر دوڑاتا اور کہتا ”کہہ دو ہونڈوں کہاں دیکھوں“ اسی خیال میں مستغرق گھر میں داخل ہوا، تو سب سے پہلے اس کے بیٹھنے کا کوہِ سونا نظر آیا، جانا زخمی مگر پڑھنے والی نہ تھی، پلنگ تھا مگر بیٹھنے والی نہیں، دونوں کاٹنے دوڑے، بڑھا اور سنجیدہ کی گردن میں ہاتھ ڈال کر چنچیں مارنے لگا، سنجیدہ اس وقت آنکھیں بند کئے بالکل خاموش تھی۔ پانی منگوایا، پلوایا اور کہا۔

”و میں مسلمان ہوں، گھائل یا جاہل جیسی بھی ہے۔ مگر میرا عقیدہ یہ ہے کہ عورت کی مغفرت کا بڑا حصہ شوہر کے ہاتھ ہے، زندگی شروع ہو کر ختم ہونی آفتاب طلوع ہو کر غروب ہو چکا، اب اندھیری رات ہے، تمہارے گھر کی رونق، تمہاری زندگی کی شریک، اور تمہاری عمر کی رفیق، میری پیاری بچی، میری آنکھوں کا نور

میرے دل کا سرور اس وقت جنگل بیابان میں تنہا پڑی سوتی ہے گھس کر
چہل پہل جنگل کے سناٹے سے، نرم گرم بھوننے درخت کے پتوں سے
نواڑی پلنگ تیر کے گرٹھے سے، اور سفید چادر مٹی کے ڈھیر اور خاک کے
انبار سے بدل گئی، ایک ہونکا میدان ہے۔ جہاں اعمال و افعال کے سوا
کوئی کام آنے والا نہیں۔ ہاں تھاری اور صرف تھاری عنایت اس کی
قبر گلزار اور اس کا بیڑا پار کر سکتی ہے، رونا بے سود اور رنج بیکار ہے
قسیمہ اگر اس کی محبت سچی تھی، تو محبت کا ہاتھ اس کی طرف بڑھا وہ جس طرح
زندگی میں تیری دست نگر تھی، آج بھی تیرے کرم کی محتاج ہے
رگر اور کہہ۔

تو اے بھوہ تو جس کی حکومت کو فنا اور جس کی طاقت کو کبھی زوال
نہیں تو وہ جس کی سلطنت سچی، جس کا فیصلہ حقیقی، جس کا قانون اٹل، تصدیق
اپنے اس پیارے کا، جس کی بیویاں ہماری مائیں، طفیل اس کے ارشاد کا
جس نے بیوی کی مغفرت شوہر کی رضا مندی میں دکھائی، میری گنہگار بیوی
کو جو ار رحمت میں جگہ دے۔“

قسیمہ جہاں تک غور کرنا تھا تمام عمر میں کوئی دن، اور کسی دن کا کوئی
واقعہ ایسا نہ تھا، کہ وہ بیوی کی شکایت کر سکے، اس کے غصہ کو ہمیشہ سر پر رکھا
اس کی خفگی سدا آنکھوں سے لگائی، حد یہ ہے کہ مرض الموت میں بھی اپنے
پاس انگلیٹھی رکھ کر اس کا ناشتہ اپنے ہاتھ سے گرم کیا، نوکر چاکر گھس موجود
تھے۔ گھر گرمی کے دنوں میں جب وہ کچری سے آتا تو اپنے ہاتھ سے کھڑے ہو کر
پنکھا جھلاتی، بچوں والی ہوئی، پوتا پوتی آگے کھیلے، لیکن اس وضع میں فرق
نہ آنے دیا کہ ہمیشہ اس کو کھلا کر کھایا اور سلا کر سوتی، اب سنجیدہ کا

اصرارِ قسیم کے زخم پر نمک تھا۔ ڈاڑھیں مار مار کر رو رہا تھا کہ سنجیدہ نے روشنی اپنے پاس منگا کر خط نکالا اور کہا ”میرا پلویں کا خط تم پڑھ چکے۔ یہ اس کا جواب ہے اس کو بھی سن لو، تاکہ معلوم ہو جائے کہ میں کیوں مصر ہوں۔ اسکے بعد سنجیدہ نے خط پڑھا تو یہ تھا:

بھوپلی جان کی خدمت میں فرمانبردار کنیز کی طرف سے
دست بستہ آداب آپ کا خط پہنچا سر پر رکھا، آنکھوں سے
لگایا، ہر سطر کلیجہ کے پار اور ہر حرفِ حقیر کی لکیر تھا، شفقت کی تصویر
محبت کی تقریر نے کلیجہ دہلا دیا، کچھ شک نہیں، کہ زندگی کے تعلقات
فانی اور محالِات عارضی ہیں، حکومت اور مسرت حیات انسانی
کے جہان ہیں آئے ہرے اور چلے گئے، حقیقی فرحت اور اصلی
مصیبت، مالک کی رضا مندی اور اس کا عذاب ہے، مگر بھوپلی
جان کیا کروں انسان ہوں، مانتا نے جان پر بنا دی، کرتی کچھ ہوں
ہوتا کچھ ہے کہتی کچھ ہوں نکلتا کچھ ہے۔ صبر کی کوشش جہاں تک
ممکن ہے کرتی ہوں، مگر اس دل نے پریشان کر دیا۔ تین برس
کی جان بچہ نہیں، پھیلا وہ تھا، میری صورت کا عاشق، میرے
نام کا دیوانہ، مرتے مرتے میری گردن سے ہاتھ نہ نکالے۔ جانتی ہوں
کہ آرزوئے موت جائز نہیں، مگر کہتی ہوں کہ سنجیدہ جیسا لال
جنگل میں جاسوتے اوریاں زندہ رہے۔ بھلائی ہوں نہیں بھولتا کس
طرح بھولوں، ہنسی ہی جوتی، ڈلا سی ٹوپی، اتنی سی کٹڑی، یہ چیزیں
رہ گئیں اور چیزوں والا نہ رہا! گھر کا کونہ کونہ اس کی یاد تازہ اور
خیال زندہ کر رہا ہے۔ کہتی ہوں ادھر سے نکلا، ادھر سے آواز آئی

آئے گا چمے گا روئے گا پچھے گا، کوٹھری میں دیکھتی ہوں۔ دالان میں جھانکتی ہوں، اندر جاتی ہوں، باہر آتی ہوں، مگر وہ صحت نظر نہیں آتی۔ جمہرات تک خاصا اچھا کھیلتا مالتا پھر رہا تھا میں نے نہر کی ناز پڑھی۔ میرے برابر بیٹھ کر سجدے کیے جتنی حاجت کر اللہ اکبر کہا۔ میں نے گود میں لیا۔ پیار کیا، چمٹ گیا، اور کہنے لگا "اماں ہمیں پان نہیں دیا بھول گئیں" ہائے پھر بھی اماں موت میرا لال توڑ گئی اور اس کی یاد میرا کلیجہ توڑ رہی ہے میں اس دکھ سے بیخبر، درد سے نا آشنا، اور اس مرض سے لاعلم تھی، اب معلوم ہوا کہ بندے اور خدا کا واسطہ خالق و مخلوق کا تعلق اسی کسوٹی پر کھلتا ہے۔ دعا کیجئے، کہ خدا میرے دل کو صبر میری زبان کو شکر اور مجھ کو تقویت دے میں اُس کے حکم پر حاضر اور اس کے فیصلہ پر راضی ہوں، امانت تھی لے لی میں دخل دینے والی کون!

رہا اُن کا معاملہ وہ میرے سر تاج ہیں میری اُن کی برابری کیا اور لڑائی کیوں، وہ مرد میں عورت، وہ حاکم میں محکوم، وہ شوہر میں بیوی، مطمئن رہئے ماں کے دودھ اور آپ کی گود پر پرورش نہ آئے گا۔ میری انسانیت اور آپ کی تربیت بدنام نہ ہوگی گرجاؤں گی، مرجاؤں گی، زمین کا پیوند ہو جاؤں گی مگر سادات کے خون اور باپ دادا کی آن میں فرق نہ آنے دوں گی، نفرت محبت سے زیادہ اور ناموافقت موافقت سے بڑھ کر تابع بنادے گی، جس ہاتھ میں ہاتھ دیدیا۔ اب اس میں محبت

کی دیا رہو یا خیر آبدار! پرستش کروں گی۔ نسیم کلید کا ٹکڑا
 اور سلطنت زندگی کا چراغ تھا، نسیم جان کا مالک اور سرکار
 سترج ہے، اس کا غصہ رحم، اس کا ستم کرم، اس کا عتاب ثواب
 اور اس کی اذیت شفقت ہے، نفرت کے قابل ہوں در سرت،
 غصہ کے لائق ہوں جانزگر عنایت کا نشان نفرت میں اور محبت
 کی جھلک غصہ میں موجود ہے، رابعہ، ہاجرہ بچیاں ہیں، سمجھ نہ
 سکیں، غلط کہہ دیا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مجھ کو ان سے شکایت
 نہیں، میں اس سر پر قربان ہوں، یہ پاؤں وہود دھو کر پیوں تو
 بھی فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکتی، آرزو یہ ہے کہ جن ہاتھوں
 نے پالکی سے اتارا وہی زمین کا پیوند کر دیں امید ہے کہ مالک حقیقی
 میری آرزو پوری کرے گا، مجھے اپنے خدا پر بھروسہ اور
 اُس کی پاک ذات سے پوری توقع ہے، کہ میری التجا قبول ہوگی
 اور وہی ہاتھ جو آپ کی دہلیز سے اس چوکھٹ تک لائے اُس گھر
 سے اصلی گھر پہنچا دینگے۔ نسیم کی موت خون کے آنسو روا رہی
 ہے، دیوانوں کی طرح پھرتی ہوں سودائیوں کے مانند رہتی ہوں
 جانتی ہوں، کہ میری ذات سے اُن کو تکلیف پہنچ رہی ہے اور
 یہ صدمہ بھی کم نہیں، دنیا اور دین دونوں برباد ہوئے بچہ
 کافراق، شوہر کی ناخوشی، مجھ سے بڑھ کر بد نصیب کون ہوگا اگر
 خیال سچا اور توقع درست ہے، تو میری موت وہ موت ہوگی
 جس سے دوزخ بھی پناہ مانگے گی۔ کوشش کر رہی ہوں کہ بضامند
 کر لوں، لیکن زندگی کا اعتبار نہیں، اگر موت آگئی اور اتنی کیا آج

آئی تو اور کل آئی تو، آنا برحق اور ملنا محال، تو آپ سے درخواست ہے کہ نسیمہ کا جنازہ اس وقت تک نہ اٹھے جب تک نسیمہ اس کے قصود نہ محال کر دے“

نسیمہ پھلی کی طرح ٹرپ رہا تھا، اس کی زبان سے صرف اتنا نکلا کہ نسیمہ بیوی نہیں چندن، اور عورت نہیں کنزن تھی جو اپنی شہرت کا ڈنکا ایک عالم میں بجا گئی میرا منہ اس قابل اور یہ گھر اس لائق نہ تھا، کہ میری زندگی اس عورت سے اور میرا گھر اس نور سے روشن ہوتا، خدا مرنے والی کو جنت الفردوس میں جگہ دے“

(۲)

جب دنیا ناپائدار کی اس قابل ناز ہستی کا جو نسیمہ کی صورت میں بزمِ اسلام کے صنفِ نسوان کو منور کر گئی دم و اسپین شروع ہوا اور آہنچا وہ وقت جب نسیم جیسے پھول اور نسیم جیسے شہرے کھڑ جانے والی ماں کی روح جس نے اپنا بچوں کے زخم، ناتوانوں کے درد، بیماروں کے دکھ، اور یتیموں کی آہ میں اپنے بچوں کے کھڑے تلاش کئے، جسد خاکی کو وداع کہے، تو فرشتہ موت نے باواز بلند کہا کہ ”آج عالم بالا میں اس روح کا داخلہ ہے جو حیاتِ انسانی کے ہر جزو میں بے مثل رہی اور بے نظیر آئی، مبارک تھی وہ دنیا جو نسیمہ جیسی بیوی کا مسکن ہوئی اور خوش نصیب ہے وہ سرزمین جو اس نیک عورت کا مدفن ہوگی، دنیا ہے اسلام بالعموم اور دنیا ہے نسوان بالخصوص دیکھ چکی کہ کس طرح ایک مسلمان عورت ہر حیثیت میں چاند بن کر دلی اور پھول بن کر ہنسی، اب عالم ارفاح دیکھے کہ دنیا کی نیک ہستیاں اور خدا کی پاک بندیاں کس طرح دارالجزا میں داخل ہوتی ہیں جنت کے پھولوں کا گہنا آج سنجیدگی کی مینا پر قربان اور ساہوکار پھولوں کے ہار اس کے قدموں پر نثار ہونگے، یہ ہے وہ انسان خود کا مہیا جس کا استقبال

کرے گی اور مغفرت جس کو سر آنکھوں پر جگہ دے گی
 ”بیٹی ہو کر بابا پ کے، بہن بن کر بھائی بہنوں کے، چھوٹی ہو کر بڑوں اور
 بڑی بن کر چھوٹوں کے حقوق اور خیال مرتے دم تک فراموش نہ کئے، بیوی بنی تو
 ایسی بنی کہ شوہر اور شوہر کے گھر والے ہر وقت اس کا کلمہ پڑھتے۔ ماں ہوئی تو ایسی
 ہوئی کہ بچہ کا کل تین سال تک اُس ملک میں اور اُس مقام میں اُس شہر میں
 اور اُن لوگوں میں رہا جہاں خدا کا نام لینا گناہ اور مذہب کا خیال کرنا حرام
 مگر ایک وقت کی ناز قضا نہ ہوئی۔ دولت مند ہو کر حاجت مندوں کی اور طاقتور
 ہو کر کمزوروں کی غلام بنی، منطو موموں کی اعانت اُس نے کی، قوم کی
 خدمت اس نے کی، حکومت میں نخواست اور دولت میں نمسکت پاس آ کر
 نہ پھٹکی، عزیز اس کے عاشق، محمد اس کا پروانہ، بچے اس کے شیدا
 اور شوہر اس کا دیوانہ“

اب فرشتہ موت نے اوپر نگاہ اٹھا کر دیکھا اور اترنے کا قصد کیا
 کہ ایک عورت کی روح سامنے آئی، فرشتہ کے پاؤں پکڑ لئے اور کہا
 ”کچھ شک نہیں کہ مسلمانوں کا طبقہ سنواں روز بروز غن بے سامان ہوتا
 جاتا ہے۔ تعلیم جدید نے ان کے کان میں پھونک دیا ہے کہ دنیا ان کے واسطے
 اور وہ اپنے واسطے، گو وہ ایک اعتبار سے چنداں قصور وار نہیں اور ان کے
 اس انقلاب کے ذمہ دار وہ عقلمند مرد ہیں جن کی آنکھیں جدت کی لذت
 نے خیرہ کر دیں اور بغیر سوچے اور بلا سمجھے بیٹیوں کا ہاتھ پکڑا صراطِ مستقیم چھوڑ
 اس بٹیہ پر ڈال دیا جہاں کو سوں مذہب کا سایہ نہیں لگے پھر بھی اس لئے کہ
 اُن کی زبان سے قدم قدم پر اسلام نکل رہا تھا وہ اپنے ہر کام کی خود جوابدہ
 ہیں۔ ترقی کے اس دورِ خود غرضی کے اس عہد اور افرا تفری کے اس زمانہ

میں نسیم جیسی عورت کا وجود جس نے ماں باپ کے غصے شوہر کی خفگی بچوں کی اذیت پڑوس کے دکھ اور قوم کی مصیبت پر اپنی راحت اپنا آرام اپنا چین، اور اپنا سکھ قربان کیا، نعمت غیر مترقبہ تھا جس دنیا کا عطر آج تم کھینچتے ہو۔ اس میں میں بھی چالیس برس کے قریب رہی مردوں سے سابقہ ہوا عورتوں سے پالا پڑا، تعلیم قدیم کو دیکھا، تعلیم جدید کو پرکھا، شوہر کا عیش کیا، ما باپ کا پیار دیکھا، عزیزوں کی محبت دیکھی، بچوں کی کمائی کھائی خوشی کی گھڑیاں دیکھیں، مصیبت کے پاؤں پیسے، مگر جو محبت، جو کرم، جو عنایت، جو خلوص اس نیک بی بی میں پایا جس کی روح تم آج قبض کرتے ہو اس کی مثال دوسری نہ ملی! میری گردن اس کے احسان سے، میں خود اس کے کرم سے اس قدر دینی ہوئی ہوں کہ اس سے سبکدوش ہونا آسان نہیں عالم راج کے سردار کا مجھ سے اقرار ہے کہ میری ایک التجا قبول ہوگی میں نے اپنی درخواست آج ہی کے واسطے محفوظ رکھی اور اب وقت ہے کہ تم اس سے پہلے کہ نسیم کی روح قبض کرو میرا پیام اپنے سردار تک پہنچا دو تم خود میری داستان سنو اور بتا دو کہ میری خواہش کہاں تک درست ہے۔

میں ایک خوشحال باپ کی پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ مگر اس لئے کہ ماں چکی تھی میری شادی کی زیادہ چھان بین نہ ہو سکی، یہ صحیح کہ باپ زندہ تھا اور یہ بھی درست کہ دوسری بیوی کا شوہر بھی نہ تھا۔ مرد تھا باتیں صحیح! اقرار درست! اور زبان سچی سمجھ لیا اور نکاح کرنا تھیں ہاتھ دے دیا اور میں ایک ساس کے پھندے اور ایسے شوہر کے قبضہ میں جا بھنسی جو جاہل مطلق تو نہیں مگر کچھ ایسا پڑھا لکھا بھی نہ تھا، بیچ کی راس کا انسان تھا خیالات پشت انگلیں جھوٹی، حوصلے ذلیل اور یہ سب صرف اس وجہ سے کہ اس کی صحبت خراب

اور اس کے دوست معقول نہ تھے مجھ کو پہلی مرتبہ اس کی بے حیائی کا اندازہ اس وقت ہوا جب وہ آٹھ دن کی بیباہی دہن کے واسطے گڑکی گڑک اور تیل کے سمو سے لایا۔ لایا اور لا کر اصرار کیا، اصرار کیا اور زبردستی کھلا کر چھوڑا، حاشا وکلا مجھے اس پر اعتراض جب تھا نہ اب ہے وہ گڑکی نہیں خالی تلوں کی اور تیل کی نہیں پانی کے سمو سے لاتا میں اس سے چوری کی متوقع اور ڈاکہ کی خواستگار نہ تھی، افسوس اس کا ہے گڑک تول میں پچی ادھ سیر اور سمو سے گنتی میں پورے بیس ستر کر بھگے اور پھنک کر گئے کہنے کو تو ایک معمولی بات تھی ہو گئی مگر سمو سے نابکار کافی یادگار اور گڑک نامراد پورا اثر چھوڑ گئی، تین دن اسی چکر میں رہی کہ شوہر نے نیا گل کھلایا اس موت کے پھول، اس زخم کا نمک، اس عنایت کا غضب، اور اس واقعہ پر طرہ یہ پیش آیا کہ ماں بیٹوں کی باتیں ہو رہی تھیں صاحبزادے صاحب فراتے کیا ہیں ”ہم تو جانتے ہیں کہ جنت تمہارے قدموں میں ہے“ اس سے کس کم بخت کو انکار ہو سکتا ہے۔ سچ کہا درست کہا۔ مگر اس کے آگے کیا ارشاد ہونا ہے کہ ”تم آدمی رات کو کہو کہ کنوئیں میں جاگرو۔ اور میں انکار کروں تو کلامہ نصیب نہ ہو۔ میاں نے یقین دلایا قسم کھائی اور ساس بیٹی سنفتی رہیں مگر مجھے معلوم ہو گیا کہ میاں چشم بدور اور ساس نوؤ علی نور اٹھاؤ کو نڈا کسبہ کا کنبہ ہی بھونڈا ہے۔ مایٹے سے سوا اور بیٹا ماسے بڑھ کر۔ مگر بندھ گیا سو موتی اور رہ گیا سو کسکر نکاح گڑیا کا کھیل اور ترنی کی میل نہ تھا بندھا تھا بندھ گیا اور جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب میں اس منکر میں رہی کہ بڑھے ہوئے لپکے اور پٹری ہوئی عادتیں کیونکر چھٹاؤں۔ زندگی کی تلخی ظاہر اور عمر کی یر باد ی پیش نظر تھی۔ یہاں اگر یہ الزام آتا جان پر رکھوں

تو شاید غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے حالت دیکھی صحبت نہ دیکھی، ہڈی پر رکھی، تربیت نہ پر رکھی، بیٹی گھر کا کوڑا اور نکاح سر کا بوجھ نہ تھا کہ نکال باہر اور اتارا الگ کیا، معصوم چڑیاں عمروں کے سودے میں جب زندگی ہی غارت ہوئی تو ہڈی کو بیٹھ کر کیا چھوڑنا ہے دولت نہ ہوئی نہ سہی، حشمت نہ ہوئی مقتدر، مگر اختلاف مزاج تو نہ ہوتا، میری تعلیم یہ کہ مردوں کے حقوق عورتوں پر اور عورتوں کے مردوں پر ان کا عقیدہ یہ کہ ماں کے قدموں میں جنت اور بیوی پاؤں کی خاک، مگر حق یہ ہے کہ قابل الزام وہ نہ ہیں میری تعلیم نہ ان کا عقیدہ، قابل الزام وہ ہیں جو اسلام کو بدنام کریں یہ کام مایاؤں کا تھا اولاد کو بتاتے کہ ہمارے تم پر اور تمہارے حقوق ہم پر ہیں کیا، مالک کراس اور باپ جلدی سے خسر بننے کو ہو بیٹھے اور یہ نہ بتایا کہ پرانی جائی کے بیوی بٹکر تم پر اور تمہارے شوہر ہو کر اس پر کیا حقوق ہیں۔

المختصر مجھ کو اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ ان کو اپنے رنگ پر ڈھالوں یا خود ان کے ڈھنگ پر ڈھل جاؤں، ان کو اس طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ موافقت کی ضرورت مرد بچے جو جی چاہا کیا۔ جو منہ میں آیا کہا، مصیبت تو میری تھی عورت ذات جو پڑے وہ اٹھاؤں، جو آئے وہ بھگنوں، کوشش شروع کی مگر اختلاف مزاج کی بھی کوئی حد ہوتی ہے آسمان و زمین کا فرق اور مشرق مغرب کا بُعد تھا۔ میرے اختیار میں ہو تو اپنی روٹی محلہ بھر میں تقسیم کروں اور بچے بچائے ٹکڑوں سے پیٹ بھروں، ان کا بس چلے تو معصوم بچہ بلکتے کا بلکتا رہ جائے، اور اس کے ہاتھ سے جلیبی چھین کر صاف چٹ کر جائیں، ایسے شوہر سے مناسبت بڑی کٹھن منزل اور ٹیڑھی کھیر تھی۔ لوگوں نے سمجھانے میں جو درحقیقت سمجھانا نہیں بہکانا تھا کسر نہ چھوڑی اور

ہر طرف سے یہی صدا کان میں آئی کہ شوہر کو چھوڑ چھاڑ سیکے جا بساؤں، گو باپ کا دم موجود اور گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور میں خوب سمجھتی تھی کہ ابا جان اگر میری پریشانی کی اڑتی سی خبر سن پائیں گے تو دونوں ما بیٹوں کو نچا دیں گے۔ مگر یہ بھی پورا یقین تھا کہ اسی گھر میں مرنا اور اسی شوہر کو بھرنایا نکاح پھولوں کا لاریا لوہے کی زنجیر یہ تقدیر پر منحصر ہے مگر کچا دھاگہ نہیں کہ جب چاہا توڑ لیا جب ضرورت ہوئی جوڑ دیا، بڑوں کی مثل ہے لایسے سچنوں کی بیٹیاں جو رکھیں بچوں کی لالچ، گھر سے وداع ہونا تھا ہو گئی، اب پیچھوں کی لالچ اور بزرگوں کی آن میرے ہاتھ ہے۔

زندگی کا یہ دو اگر غور کیا جائے تو تھوڑی یا بہت جیسے جی کی موت تھی کہ جذبہ، احساس، غیرت، حمیت سب خاک میں ملا کر مقصد حیات صرف ایک شخص کا نام کرنا رکھوں، بستی سے بلندی اور خدمت سے عظمت معلوم تھی مگر نفسانیت کا خاتمہ کرنا بھی آسان کام نہ تھا۔ لیکن دلی شکریہ کے مستحق ہیں وہ ما باپ جنہوں نے بچپن ہی میں بہتہ گلوا اور مہیا نکلوادیا تھا، گو ڈربلی کہا، بھاری پتھر بنایا، الغرض مردوں کے مقابلہ میں مساوات کا خیال کبھی پاس آکر پھٹکنے ہی نہ دیا، اب اپنی حالت ظاہر اور اپنا درجہ روشن تھا نتیجہ یہ ہوا کہ مصیبت کی گھڑیاں اور ذلت کی کڑیاں، ما کا دودھ اور شہد کا گھونٹ بنیں۔ کلیجہ پھلنی ہوتا تھا، دل پر گھونٹنے لگتے تھے مگر تیوری پر بل اور زبان پر شکایت نہ آتی تھی، بڑا زیر دست کچو کا ساس کی جلتوائی تھی، جس نے ہر سفیدی کو سیاہی اور ہر بھلائی کو بُرائی بنایا۔ کُنٹوں سے بدتر زندگی اور لونڈیوں سے اتر حالت تھی، کیا جو کر سکتی تھی اور کرتی رہی جو ہوتا تھا مگر ان کوششوں کا نتیجہ اس عملی کا انجام، پتھر پر کیا جونک لگتی۔ شوہر

وہی جان کا دشمن اور ساس و سیبی ہی خون کی پیاسی پیاس پھر وہی کہتی ہوں کہ جب تک مسلمانوں کا تمدن قطعاً تبدیل نہ ہو جائے اور شروع اسلام کے مطابق عورت کی عزت نہ کرنے لگیں لڑکیوں کو مساوات کی تعلیم دینا سقم قاتل ہے تکلیفوں سے اکتا کر۔ اذیتوں سے گھبرا کر ایک آدھ دفعہ نہیں بار بار میں نے قصد کیا ہے کہ یہ سب بھگڑے چھوڑ چھاڑ اپنا ٹکاسا دم لے نکل کھڑی ہوں۔ میری ہمت ٹوٹی، میری طبیعت چھوٹی اور میرا جی گھبراتا، میں خود سٹ پٹاتی اور کہتی کہ موت اس زندگی سے، تنہائی اس آبا دی سے ویرانی اس مجمع سے، اور جاڑ اس سہاگ سے بہتر ہزار درجہ افضل اور اعلیٰ لیکن وہی ایک خیال تھا۔ جو اس آڑے وقت میں کام آیا، آبا جان کے الفاظ جو انھوں نے وداع کے وقت کہے، آبا جان کی نصیحتیں جو انھوں نے بچپن میں کہیں کانوں میں گونج رہی تھیں، باپ دادا کی لاج ہر ہر پہلو سے اپنا رُخ روشن دکھا کر غمگین دل کو تسکین دیتی تھی، اور دل خود بخود صدا دیتا تھا کہ نیت بھٹک گئی۔ قدم پھیل گیا طبیعت اُچٹ گئی، تو بڑوں کی آن، بزرگوں کی لاج سب خاک میں ملی، یہ ناصح مشفق اور شیر و صلاح کار بھلی گھونے میں پہننے والے اور اُڑانے والے، جلے پر اے وہی اور نہیں بٹاؤ لوگ، اس وقت تو چٹا چٹا میل اور بنایا کھیل ڈھادیں اور بگاڑیں اور پھر قہقہے لگائیں اور ٹٹھے اڑائیں، میاں ناخوش ہے تو خوش کروں، ساس ناراض ہے تو راضی، مختصر یہ کہ گو دل اکھڑ چکا تھا۔ مگر دماغ کا متواتر مشورہ یہی تھا۔

”بندگی کرنے سے کہتے ہیں خدا ملتا ہے“

پانچ برس کے قریب اسی طرح گزر گئے۔ ساس کے کلیجہ کی پھانس بدلتی ہوئی کھٹکی پس کر خاک ہو گئی مگر اس نیکی بخت کا دل چسپا، کم ہونگی ایسی بڑھیب عورتیں جن کو اس قدر

مصیبت کا مقابلہ کرنا پڑا اور نہ ہونگی اتنی کٹر ساسیں جن کے پاس شفقت اور محبت تو درکنار رحم بھی پاس آکر نہ پہنکا ہو۔ ظالم صورت دیکھ دیکھ کر گھٹنی اور باتیں سن کر خستہ ہوئی جاتی تھی میں نے اپنے کام سے کام رکھا۔ اس میں شک نہیں کہ زندگی کی یہ منزل کٹھن سے بھی سخت تھی، مگر بڑوں کی نصیحت امرت نکلی۔ اس دکھ نے سکھ دیا، اور یہ کلفت راحت ہوئی۔ ساس کی تیوری کا بل تو نہ ملتا تھا اور نہ ملتا۔ مگر ہاں میاں کی چیریں حسین ہونی شروع ہوئی، مردہوں یا عورتوں اور لڑکے ہوں یا لڑکیاں عمر عزیز کے دونوں اجزا اور دنیا سے ناپائدار کے دونوں جہاں شادی و غم خانہ دل میں آتے اور جاتے رہتے اور گزرتے ہیں، زندگی کبھی فرحت کی ایسی خوشنما دیوی سامنے لا کر کھڑی کر دیتی ہے جس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا اور کبھی مصیبت کا وہ ہمیب دیو پہاڑوں کی لہجہ بھاتی ہے جو توقعات ہی کا خاتمہ کر دے میرے والد ماجد بیمار پڑے۔ علالت کی کیفیت بدتری کی خبریں سب میرے کان تک پہنچیں۔ میری آنکھیں روئیں، میرا دل تڑپا، میری حالت بگڑی، میرا کلیجہ بیٹھا۔ مگر دونوں مسلمان روئیں جن میں سے آج ایک امان جان اپنی اعمال کی سزا بھگت رہی ہیں، یعنی شوہر اور ساس میری حالت پر دلچسپی میں اس وقت پھر کہتی ہوں کہ غلطی پر ہیں وہ مسلمان جو لڑکیوں کو مساوات کی تعلیم دیکر ان کی زندگیوں پر باد کر رہے ہیں۔ یہ تعلیم آفت، یہ تلقین مصیبت، اور یہ یقین قیامت ہے اگر اس افسی کا زہر چٹھ گیا اس آڑے کی پھنکار نہ رکی تو یہ وہ پس ہر جو گاؤں اور شہر، ملک اور قوم سب کو ڈس کر چھوڑ دیا حکومت کا نشہ پہلے مردوں کے دماغ سے اُتار دیا اور جب مسلمان ہو جائیں، اس کے بعد عورتوں کو اس سطح پر لاؤ۔ قوم برا کہے یا بھلا اور دعا دے یا بدو عا میں ہیں تو یہی کہو گی کہ کنوارا پتہ کا زہر شہر ال میں شہد بنا اور میکہ کی ذلت شہر ال میں عزت بنا

مسادات کا سجا را اگر مجھے بھی چڑھ چکنا تو شاید ایک لمحہ بھی گھر میں نہ نکلتی اور شوہر اور ساس کو چھوڑ چھاڑ بے پوچھے اور بے گچھے میکے جا پہنچتی، مگر شوہر کی برتری کا یقین رگ رگس میں تھا۔ دل پر جو گزری وہ میں جانتی ہوں۔ مگر کٹ جاسے یہ زبان اگر اُٹ بھی کی ہو۔ ساس کے کان پر تو کیا جوں جلتی شوہر ہی کے دل میں خدا نے رحم ڈالا۔ میں صبح کی نماز پڑھ کر پان ہزار ہی تھی اور بابا جان کے خیال سے کچھ کے ٹکڑے اُڑ رہے تھے کہ وہ سامنے آئے۔ میں نے آنسو پونچھ کر پان دیا۔ دیکھا، لیا اور سیٹھ جا ڈولی لالچھ سے کہا جاؤ۔ تم اپنے ماں ہو آؤ۔ میں کیا اور میری خدمت کیا کچھ خدا ہی کی عنایت تھی مگر آتا جان آئیں تو جا میں کہاں ڈولی کی آواز سن اور میری تیاری دیکھ آپ سے باہر ہو گئیں اور ما بیٹوں کی وہ جنگ ہوئی کہ خالکی پناہ مجھ کو اپنے کام سے کام تھا جھگڑا ماں بیٹوں کا میں بولنے والی کون۔ دن بھر وہ شام کو آگئی، لیکن میرا یہ کہنا غلط ہو گا۔ کہ کواری بچی اچھی طرح سمجھ لے کہ وہ نکاح کے وقت میکے ہی سے نہیں ما باپ سے بھی وداع ہو رہی ہے خدا نہ کرے کہ سنگدلوں اور جاہل کٹروں سے پالا پڑے، مگر یہ مصیبت محال نہیں ممکن ہے کہ ادھر لڑکیاں اور ادھر بابا پترس ترس کر اور پھر کچھ کچھ کر ختم ہو جائیں اور صورت دیکھنی نصیب نہ ہو، یہ اندیشے واقعات ہیں اور خطرے معاملات جو دن رات پیش آتے ہیں۔ ان حالات میں مسادات کا بیج عورت ذات کے دل میں بربادی کا سلام اور موت کا پیام ہے۔ قصہ کوتاہ آتا جان پہلے ہی جان کی دشمن تھیں۔ شوہر کے ہر بان ہونے سے کر لیا اور نیم چڑھانیک بخت نے دل کھول کر اور پیٹ بھر کر تم توڑنے شروع کئے۔ یہ وہ تھا کہ اگر شوہر کی عنایت کو کیسی ہی کم اور کتنی مختصر کیوں نہ تھی تسکین نہ دیتی تو میرے زخم پھوٹ پڑتے اور تعجب نہیں کہ میں اس زندگی ہی کو سلام کرتی۔ مجھ کو اس قیامت اور مصیبت میں کہ ہر طرف سے اذیت ہی اذیت

تھی ان کی عنایت غنیمت بلکہ امرت ہو گئی۔ مگر میں اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ یہ جو کچھ ہے محض شر خدمت اگر ذرا تیوری پر بل آیا تو بنا بنایا کھیل گیارہ پہلے سے زیادہ سیوا کی اور توقع سے بڑھ کر میوہ کھایا اور وہ دن بھی آپہنچا کہ میاں کو کبھی یقین نہیں تو شبہ ضرور ہو گیا کہ ماں ظالم بیوی مظلوم۔

ہماری آمدنی جائداد کا مختصر سا کرایہ تھا۔ شوہر صاحب اٹھانے کو تو بہت شیر تھے مگر کمانے کو خاک نہیں میرے بہت کہنے سننے یا منت غرض شام سے کبھی تلاش میں گئے بھی تو نوکری ملنے سے پہلے ہی انہر میں ہزار کیڑے ڈال دیئے، اس پر قسم یہ کہ کھانے کے بھی شوقین اور کیڑے کے بھی گویہ شوق اپنی ہی ذات تک محدود تھا اور میں یا میرے بچے اس بلا سے محفوظ مگر کبھی ہربان ہوئے تو مٹھائی کی ایک آدھ ڈلی، کیاب کا آدھا پاؤ ٹکڑا مجھ کو بھی مرحمت ہو گیا۔ بچوں بیچاروں کو تو حکم ہی نہ تھا کہ کھاتے وقت باپ سے مانگنا تو درکنار اس طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ لیں غضب یہ تھا کہ ان کے اس فعل کو مانے بھی ہمیشہ جائز سمجھا اور اگر بھولے سے بھی باپ کے کھاتے وقت کوئی بچہ آدھر بھل گیا تو بیٹے سے پہلے ماں کی آنکھوں میں خون اُتر آیا حلقہ کا شوق یہاں تک ترقی کر گیا تھا کہ انیسویں کو بھی مات کیا دن رات حلقہ ہاتھ میں، گرمی کا است رانی موسم تھا آندھیاں زور شور سے آ رہی تھیں میں نے اُس دنیا میں بھی کہا اور اس میں بھی کہتی ہوں ان آدھیوں کے سامنے بھی استسرا تھا اور تم فرشتوں کے سامنے بھی ہے کہ میں نے ابھی طرح آگ دبا اوپر سے تو آدھا تھک دیا۔ مگر نہ معلوم کیا بھوک پڑا کہ گھر میں آگ لگ گئی جب شبہ تھا اور اب یقین ہے جب نہ کہا اور اب کہتی ہوں کہ دبی دبا ئی آگ چپک نہ تھی کہ نکلتی اور پھر نکلتی حلقہ میرے بعد بھر گیا آگ دبی نہیں رات کا وقت گھر بخیر آندھا زور شور کی، ہوائے اڑی، میری آنکھ کھلی تو بغلی کا دال لیا اور سامنے کا

کمرہ دھڑ دھڑ جل رہا تھا، دم خشک ہو گیا گھبرا کر اٹھی، آواز دیتی ہوں تو نکلتی نہیں پکارتی ہوں تو لو لانا نہیں جانا۔ والان کے آگے ٹین کا سائبان تھا۔ بچوں کی چار پانچ لمبی لمبی تختیاں اور ایک طرف ان کے باپ کی، آگ ٹین تک پہنچ چکی تھی اور بڑے سے چھوٹے تک سب پڑے پڑے رہے تھے۔ بھیڑ کی لات گھٹنوں تک میں اس کے سوا کبھی کیا سکتی تھی کہ پانی بھر کر ڈالنا اور جھینا شروع کیا، جاگ تو سب پڑے مگر پانی تقریباً سے تیل کی طرح بھڑکا اور آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے انا جان گھبرا کر باہر آئیں دونوں بڑے بچے بھی نکل آئے اور ان کے آبا بھی گرو دونوں چھوٹے تین برس کی بچی اور ڈیڑھ برس کی بچہ وہیں رہ گئے! میری جان ان میں پٹری ہوئی تھی اور کلچر کے ٹکڑے غافل پڑے تھے میں نے بلبلا بلبلا کر ایک ایک کا منہ حسرت سے نکلا، اور گر گر کر اگر گر کر ایک ایک ایک سے التجا کی کہ میرے بچے اندر ہیں، آنے کو تو سارا حملہ بلکہ اور بھی ادھر ادھر کے لوگ آ بھرے تھے لیکن ایک کی ہمت نہ ہوئی کہ موت کے منہ سے میرے معصوم کو چھٹا دیتا۔ قسم یہ تھا ہر یہ تھا غضب یہ تھا کہ میری آنکھوں میں دنیا اندھیری تھی اور انا جان آگ کا سارا الزام میرے سر تقویٰ رہی تھیں غصہ کی کوئی انتہا نصیحتوں کی کوئی حد سارے کنبہ اور پورے خاندان کو الٹ ڈالا۔ مانتا اگر کوئی معنی رکھتی ہے تو دنیا واسے ایماندار اس کا فیصلہ کریں۔ اولاد واسے ما باپ بتائیں کہ کیا گندہی ہوگی اس کمبخت کے دل پر جس کے ایک چھوڑ دودھ پھلر واسے لال اُس کی آنکھوں کے سامنے آگ میں جھن رہے ہوں۔ موت تیل کی طرح ان کے سر پر منڈلا رہی تھی شعلے والان میں نہیں میرے کلیجے پر تھے مگر کان برابر الٹی چھری سے ذبح ہو رہے تھے یہ توقع اس وقت غلط تھی مگر آج صبح ہے کہ انسانی صورت میں وہ گروہ جو حکومت کے واسطے عورت پر فضیلت کا مدعی ہے میرے سامنے تھا۔ مگر ان کے کلیجے پر پتھر

تھے ان کی آنکھیں بخیر تھیں ان کے دل نو ماٹھے وہ مسلمان تھے ان کا مذہب اسلام تھا لیکن ان میں سے ایک منفق ایسا نہ تھا کہ گھر کی نہیں مانتا کی آگ کو ٹھنڈا کر دیتا میں جانتی ہوں مجھے معلوم ہے میں نے بڑا ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمان ترقی یافتہ افراد بغیر وجہ کے بات نہیں کرتے اور مجھے ان سے توقع کا کوئی حق نہ تھا مگر یہ کیا اندہ یہ تھا بڑے سے چھوٹے تک ہر شخص سیر دیکھنے اور لطف اٹھانے والا تھا یہ صحیح کہ ہر جگہ میں لذت ہے اور یہ منظر معمولی نہ تھا ایسے موقعے کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ مگر اتنا میں اب بھی کہو گی کہ اگر ان کا فیصلہ یہ تھا کہ بد نصیب ماکو ہم سے مدد لینے کا کوئی حق نہیں تو کائنات کا فیصلہ یہ ہے کہ قابل ملامت ہیں وہ ہستیاں کہ جب اعانت کے قابل اور دشگیری کے لائق نہیں تو آنے کی وجہ ٹھیکہ کا سبب؟

جہیز کے کپڑے میرے سامنے جھکناک اور تانبے پیتل کے برتن میری موجودگی میں تپ تپ کر رہے تھے مگر مجھ کو اپنے بچوں کے سو کسی چیز کا ہوش نہ تھا میں نے لوگوں سے کہا مگر وہ کیوں سنتے میں نے اس سے التجا کی جو فقط میرے ہی رنج و غم کا شریک نہیں مصیبت زدہ محصوروں کا باپ تھا۔ وہ میرے نہیں اس کے بھی کلیجے کے ٹکڑے اور آنکھوں کی ٹھنڈک تھے لیکن بد نصیب آنکھیں درخشاں کے وقت اس کی ہمدردی کی منتظر تھیں۔ اس کی خاموشی دیکھ کر نا کام لوٹیں۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہوا کا نقارہ چاروں طرف بج رہا تھا اور آگ کے شعلے لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہے تھے۔ آسمان کی خاموش محفل جمی ہوئی تھی چادر مہتاب میرے قدموں میں اور تارے میرے سر پر تھے کہ میں اس کی طرف بڑھی جو پتلا و آواز اور حقیقی بادشاہ تھا میری زبان بند تھی۔ مگر میری آنکھوں نے اس کو سجدہ کیا ابھی میری التجا ختم نہ ہوئی تھی کہ میرے برابر ایک برقع پوش عورت آئی اور کہا ”بچے کوئی دم میں خاک ہوئے چلو لڑکے کو تم اور لڑکی کو میں لیتی ہوں“ عورت اتنا ہلکا آگ

میں گھس گئی اور اس کے پیچھے پیچھے میں، اس نے لڑکی کو اٹھالیا میں تو کہتی ہوں وہ
 بی بی جنت، کافرشتہ اور آسمان کی حور تھی بچتی کو کلیجہ سے لگا کر برقع اٹھا اپنی
 جان نسران کر باہر نکلی، اس کی قربانی نے میری بہت، اس کے اسلام نے
 میرا دل، اور اس کی انسانیت نے میرا حوصلہ بڑھا دیا اور میں بھی بچہ کو بے باہر آئی
 خلیل کی آگ کو گلزار کرنے والا خدا ہمارا مددگار تھا ہم زندہ سلامت نکلے اور بچہ پر
 بھی آنی نہ آئی مگر بچہ جو میری گود میں تھا جل گیا، ڈیڑھ برس کی بساط ہی کیا تھی،
 ایک ٹانگ بھرنے ہو گئی خدا دشمن کو وہ گھڑی نہ دکھائے، بچہ کی ایک سچ
 زمین اور ایک آسمان پر تھی۔ مائیں جان سکتی ہیں کہ اس کا حالت کرب میں
 خاموشی سے منہ کھولنا اور میرا منہ بگمنا مجھ سے کیا کہہ رہا تھا آتا جان دیں وہاں
 بھی کہتی تھی اور یہاں بھی کہتی ہیں، خدا بخشے صاحب اولاد تھیں مانتا سے آشنا او
 لگی سے واقف، مگر ان کو اس کی تکلیف یا موت دونوں سے واسطہ نہ تھا، ان کو قلق
 تھا اور یہ کہتی ہوں کہ بچا تھا، ان کو صدمہ تھا اور مجھے اقرار ہے کہ درست ان کو غم
 تھا اور میری رائے میں ٹھیک، کہ گھر میں آگ لگی مال برباد ہوا جمع غائب ہوئی
 لیکن ہر چیز سپاہ ہو جانے اور ہر نقصان پورا ہو سکے والا تھا۔ مگر سعید جیسا لال
 ما کے کلیجہ سے بچ کر دوبارہ چٹنے والا نہ تھا ان کو اگر محبت نہ تھی نہ سہی، ہمدردی
 نہ تھی بلا سے، مگر غضب یہ تھا کہ وہ اس حالت میں بھی آگ کا بار مجھ پر رکھ رہی تھیں
 مجھ کو بچہ کی صحت کی اور ان کو میری لاپرواہی کی تسلیج تھی، میں لاکھ برباد ہزار غریب
 تھی اور فرمانبرداری میرا شیوہ، مگر میرے حواس اور عقل ٹھکانے ہوتی تو یہ نہ ہوتا
 کہ خاموشی شوہر کو بھی حیرم کالین دلا دیتی، حیا جزو ایمان اور بزرگوں کے سامنے
 خوشی جو ہر شرافت ضرور مگر ایسے موقعوں پر حیا اور ادب دونوں حماقت مگر میری
 خوشی شرافت تھی نہ حماقت، مجھ پر تھی اور معذوری مجھے اگر ہمیشہ تھا تو

صرف اتنا کہ بچہ کو نکال اس فرشتہ غیبی کو دیکھا جس نے عورت ذات ہو کر مردوں کو مات کیا اور دکھائی کہ ابھی اسلام کے نشان مسلمانوں میں موجود ہیں، میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا چاروں طرف ڈھونڈا مگر وہ صورت نظر نہ آئی، رات کتنی تھی کٹ گئی، پوچھٹ رہی تھی کہ بچہ نے آنکھ کھولی، آما جان چیخ پیٹ کر شوہر صاحب بگڑ بگڑ کر سوچ چکے تھے اور میں اس پھول کو ٹنگلی لگائے دیکھ رہی تھی اس کا آنکھ کھولنا اس جنت سے جو آج میسر ہے اور اس نعمت سے جو اس وقت حاصل ہے کم نہ تھا آما جان کا نقصان اتنا کیا اگر اس سے ہزار گنا زیادہ ہوتا میں اس صورت پر قربان کرنے کو موجود تھی میں نے اس کو قطرے کو جو ان کو مصیبت اور بچہ کو راحت تھا سینے سے لگایا، بچہ کہنے کو ڈیڑھ سال کا تھا لیکن ایک پھول تھا جس نے گھر بھر کو ایک مینا تھی، جس نے سارے محلہ کو ہکا اور چہکا رکھا تھا اس غضب کی باتیں بناتا اور اس قیامت کے فقرے ڈھاتا تھا کہ سننے والے بھی لٹو ہو جاتے تھے۔ مینے بے خبر سوتے تھے اور میں اس کو کندھے سے لگاتے۔ دوا کی فکر میں ٹہل رہی تھی آفتاب کی مادھم شعاع تیزی سے اور بچہ کی خفیف آواز سختی سے تبدیل ہوئی اور اس کے بعد ہی آما جان کلمہ پڑھتی اُٹھ بیٹھیں۔ حاشا وکلام میرا یہ یقین اب تو کیا جب بھی نہ تھا کہ دادی سعید کی جان کی دشمنی وہ اگر میرا لال تھا تو ان کے لال کا لال، ماما کے بعد ان سے زیادہ شفیق اور باپ سے اتر کر ان سے زیادہ رفیق اور کون ہو سکتا تھا مگر اس کا قصور اتنا تھا کہ وہ مجھ دشمن کا دوست سو دشمنوں کا دشمن تھا اور میری دشمنی منحصر تھی محض مشارکت پر کہ سعید کے باپ ان کے صاحبزادے اور میرے شوہر، سچ پوچھو تو یہ مشاکلت صرف سمجھ کا پھیر اور طبیعت کی کمزوری تھی، ورنہ ان کا رشتہ جد امیرا تعلق الگ، شرکت کا واسطہ کیا یہ مسلمانوں کا تمدن اور ماؤں کی توہمات کہ

لڑکوں کی پرورش اور خدمت کریں اپنی مانتا کو، اور کریں کیا کرنی پڑے قدرت کے قانون اور فطرت کی مجبوری سے، اور توقع رکھیں معاوضہ کی! بین ہرگز ہرگز یہ نہیں کہتی کہ لڑکے کی شادی ہوتے ہی ماؤں کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال باہر کریں، ان کا حق بچان کی خدمت درست، ان کی محنت جائز، میں جانتی ہوں جنت مالکے قدموں میں ہے لیکن اولاد سے توقع اتنی ہی رکھیں جتنا خود ما باپ کے ساتھ کیا۔ غیر مرد کی بیوی بنی اپنے ما باپ کو سلام کیا، بیٹا غیر عورت کا شوہر ہوا، مامی جتنی خدمت کرے غنیمت یہ کیا مصیبت ہے کہ میاں بیوی کے واسطے جڑاؤ گلو بند لایا اور آتا جان کی آنکھوں میں خون اُترا! کیوں؟ اس لئے کہ توقع یہ تھی کہ اس کی تمام کمائی مامی مالک اور بیٹی کی مختار ہیں، پالا پوسا پڑھایا لکھایا، میری وجہ سے یہ اس لائق ہوا کہ کچھ کما سکے کس قدر لغو توقع، پھر خیال اور فضول امید ہے۔ اسی غلطی کا شکار میں ہوئی اور ایک میں کیا خدا مسلمانوں کو رکھے، اُن کے تھن کو رکھے، اُنکی نفسانیت کو رکھے نہ معلوم کتنی نازک ہستیاں اور معصوم روہیں اس دیوی کی بھینٹ چڑھیں اور چڑھیں گی، بچہ میری گود میں تھا اور میں دوا کی دُھن میں غرق کہ آتا جان میرے پاس آئیں بچہ کو گود میں لیا، چمکا را پیا کیا ٹانگ دیکھی پھپھولے دیکھے اور کہہ دیا وہ کچھ نہیں منگے کی کاہی اور دوا کی سیاہی لگا دو، شوہر صاحب بھی اٹھ بیٹھے تھے اور اب آتا جان کی گفتگو میں سوا مالی نقصان کے بچہ کا ذکر تک نہ تھا آگ کی خبر سنکر آتا جان بھی تشریف لائے اور یہ پہلا اتفاق تھا کہ وہ میری چوٹ پر تشریف لائے آتا جان نے اُن کی دل آزاری میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور اُن کو اس محبت کی ایسی کافی سزا دی کہ شاید اس عالم ارواح میں بھی وہ ذائقہ یاد ہوگا۔ مجھ پر جو گزری وہ مُسنائی مشکل اور بیان کرنی ناممکن اور ہر مانتا نے میرے ہوش حواس زائل کر دیئے تھے اُدھر ان کی زبان درازی اور اس پر طرہ آتا جان

کی خاموشی میرے دل پر تیر لگے میرے کلیجے پر بھلیاں کوندیں، مگر بچہ کے آگے اپنا خیال رانہ باپ کا۔ ابا جان سننے لگے تو میں نے کہا ”ڈاکٹر یا حکیم کو بلا دیجئے“ انھوں نے مجھے توجہ نہ دیا۔ مگر چپکے سے جا، ڈاکٹر کو ساتھ لا، بچہ کو دکھا دیا میرے زخم پر اور چرکا لگا کہ بات کا بنگلڑ میل کا بیل اور تیل کا پہاڑ بنا اور ابا جان نے ان دونوں کے منہ پر صاف کھدیا۔ مفت کا روپیہ حرام کی دولت ڈاکٹروں کو دو۔ دوا میں اٹھاؤ خوا خواہ کے ٹکٹوڑے بچہ اچھا بچھا، جلنے کا نشان نہیں پھپھوڑے کا پتہ نہیں، وہی پُرانا ڈو کھپتی ہے؟

میں تو کیا جواب دیتی ابا جان اور ڈاکٹر دونوں مسکرا کر خاموش ہو گئے دوا اور مرہم آئی مگر پلائی نہ لگائی ارادہ وہی کر رہی تھی کہ ابا جان آئیں۔ دونوں چیزیں اٹھالیں اور کہا ”ایسا غضب بھی نہ کرنا کہ یہ آگ دیدہ بچہ پھٹکا بھی نہ کھائیگا۔ ایسی ویسی ہوگئی تو مہاراکیا جائیگا۔ ہمارا پلا پلا یا بچہ ہاتھ سے جاتا رہے گا۔“ میں منہ بکھتی رہ گئی اور وہ دو کی شیشی اور مرہم کی ڈبیہ بے چلتی ہوئیں۔ میں تم آن دیکھتوں کے آگے اس مقام پر جہاں جھوٹ کی ضرورت نہ سچ کی حاجت خدا کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ بارہ تیرہ گھنٹے کا لمبا دن صاف گزر گیا مگر اس معصوم بچہ کو دوائی ٹھنڈائی نصیب نہ ہوئی۔ دونوں مایہٹوں نے میرے سامنے کھانے کھائے۔ مگر اُن کو مجھ سے پوچھنا قسم تھا، رات اپنے ساتھ مصیبت کا پہاڑ لئے سر پر آئی، اور وہ وقت بھی آگیا کہ بیہوش بچہ کو گود میں لئے میں اس صورت کو تک رہی تھی جو اور ایک آدھ روز کی جہان تھی، دن میں دو تین مرتبہ دودھ پیا مگر شام سے وہ بھی بند تھا، میں اپنے جوش میں چپٹ چٹا کر منہ میں دودھ دیتی تھی منت کرتی تھی اور ناکام رہتی تھی، رات میری آنکھوں میں کٹی چاند میرے سر پر چمکا، تارے میرے سامنے جھلکاتے اور مگر وہ ہر تھیر بجائے خود فنا کا سبق اور انقلاب کا ثبوت تھا مگر دل

کو کسی طرح تسکین نہ ہوتی تھی۔ میں اس کی بلا میں لیتی تھی فدا ہوتی تھی قربان ہوتی تھی مگر وہ اپنی اس امانت سے جو قدرت نے دودھ کی صورت میں میرے پاس رکھی بیزار ہو چکا تھا، اُس کے ہونٹ کام کے قابل اس کا دماغ سمجھنے کے لائق نہ رہا وہ میری آواز کا پروانہ تھا لیکن اب وہ آواز جس نے روتے کو ہنسایا اور ملکے کو پہلایا بے سود تھی اور وہ معصوم ہستی جس نے ہمک کر ہنس کر ہنس کر اور کھل کھلا کھل کھلا کر میرے دل کی کلی کھلائی تھی، ہنسنے ہنسنے ہاتھوں سے میری خدمت کی اور پیاری پیاری نظروں نے مجھے باغ باغ کیا میری آغوش میں خاموشی تھی۔ جو کلیجہ سے گتے ہی منہ میں دودھ لے کر محبت بھری نظروں سے مسکرا دیتا تھا جو گلے میں ہاتھ ڈال کر پھینچ کر چمٹتا اس وقت اُس کی آنکھیں بند تھیں، اس کے ہونٹ خاموش تھے اس کے ہاتھ بیکار اور وہ خود لاچار۔ انسان اور انسان بھی عورت، عورت اور عورت بھی ماصر ف ما اور فقط ما سمجھ سکتی ہے کہ میری کیا کیفیت ہو گی جب میں دیکھتی ہوں گی کہ میرا بچہ میری آواز کو پہچانتا ہے، آنکھیں کھلنے کی، ہونٹ مسکراتے کی اور ہاتھ بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر ایک ٹھنڈا سانس ایک لمبا سانس میری آواز کے جواب میں مجھوری کا اظہار کرتا ہے ہوا نے صدائے حق کاں میں پہنچا کر بے ثباتی دینا کا نقشہ میری آنکھوں میں کھینچا تو میں نے دیکھا کہ آنکھوں کا تارامنہ کھول رہا ہے۔ بیتا یا نہ اٹھی کہ حلق میں شربت پٹکاؤں مگر موجود نہ تھا۔ چھاتی سے دودھ چھپ میں نکالا اور حلق میں ڈالا۔ صبح کا وقت تھا اس وقت پھر اس نے آنکھ کھولی، سجا رہا تھا میں اس کے منہ پر منہ رکھ کر لب لائی اور کہا اے چاند چھ بد نصیب پر رحم کر اُس نے میری طرف ہاتھ اٹھایا میں اس ہاتھ پر قربان ہو رہی تھی کہ ابا جان ڈاکٹر کو لیکر آئے، ان کو کیا معلوم کہ منظر معلوم کو بد نصیب ماں کے ہاں دوا تک نصیب نہ ہوئی میں بھی خاموش رہی ڈاکٹر نے کہا آج اندیشہ کم ہے مہی دوا دوا بھی اور لگاؤ بھی، دونوں دوا ہی قائم گئے ہونگے کنبھلی اُستانی مسکراتی

ہوئی اندر گھسبیں ان کی صورت دیکھتے ہی آتا جان کھل کھلا کر مہنسیں اور کہا۔
 ”اقتدری استانی کل سے تین آدمی بھیج چکی ہوں بچہ ہاتھوں میں آگیا مگر تمہیں
 گھر سے نکلتا نصیب نہ ہوا“

استانی: ”اے ہے بیوی کیا بتاؤں دم بھر کا چھٹکا را نہیں سارا دن اور
 ساری رات اسی آرجا میں گزردی ہے گھر تک پہنچنا بھی تو نصیب نہیں ہوتا راتے میں کچڑی
 جاتی ہوں کل صبح کی نکلی ہوئی ہوں ڈپٹی صاحب کی ہونے نکلنے ہی نہ دیا آٹھ برس
 کا لڑکا پہلوٹھی کا کٹھن سے گر پڑا، ڈاکٹر حکیم یہ وہ سب ہی آئے اور گئے مگر ہوتا کیا تھا
 وہاں دیکھ ہی دوسرا تھا میں تو کس قابل ہوں جب اس وقت ذرا بچہ نے بات کی تو
 ان کی جان میں جان آئی اور رخصت ملی۔ وہ بھی دو گھنٹہ کو لاؤ دیکھوں بچہ کہاں ہے“
 میری جان تو پہلے ہی نکلی جا رہی تھی استانی کم بہت کو دیکھ کر بالکل ہی خون
 خشک ہو گیا میں جانتی تھی کہ ایک چلتی ہوئی حرافہ عورت ہے جس کو آتا جاتا خاک نہیں
 مگر دخل دنیا بھر کے کاموں میں، ڈاکٹر حکیم وہ، ملا وہ سیانی وہ بچہ کی صورت دیکھ کچھ
 سوچا اور کہنے لگی ”بچا مجھ سے بچ کر کہاں جاؤ گے آگے آگے تم اور پیچھے پیچھے ہیں“
 آتا جان: ”وہی غفل ہے نہ؟“

استانی: ”اور کیا ہوتا۔ مگر میرا نام بھی استانی ہے۔ ڈپٹی صاحب کے ہاں سے
 بچکا یا تو یہاں آبراجے۔ تم ایک کام کرو ایک تو سات مہینے لال لے آؤ ایک پیسہ
 اور تھوڑی سی آگ۔ پیسہ دہکا کر مانتے پرہ دارغ دیتی ہوں اور مہینوں کی دھوئی اس
 گھر میں تڑکیا پڑوس تک میں بچا کی صورت نہ دیکھتا“

تم فرشتے ہو تم کو شاید قدر نہ ہو۔ یہ وہ وقت ہے کہ میرا بیمار بچہ جو مرض الموت میں
 گرفتار ہے میرے کلیجے کا ٹکڑا جو میرے گھر میں کوئی دم کا ہمان ہے میرا معصوم لال
 جو میری بھری گود دھالی کر رہا ہے اس کو دو نصیب نہ ہوئی اور آگ کی دہکتی ہوئی

انگلیٹھی مرچیں اور پیسہ لاکر رکھا گیا ہائے اب بھی بیان کرتے کیجیے کے ٹکڑے اُٹتے ہیں
 بھلسا ہوا معصوم جس کی ٹانگ بھرتہ ہے ظالم دادی اور قصائی باپ کی بدولت پیسہ
 سے داغا جا ہے کہ پھر دکھ نہ اُٹھے۔ پیسہ سُرخ انگارے کا لگا گیا مجھے چکر آئے میں شوہر
 کے قدموں پر گر گری اور کہا ”اللہ رحم رحم خدا کا واسطہ رحم، مر رہا ہے دم توڑ رہا
 ہے یہ ظلم نہ کرو یہ ستم نہ توڑو میری دو سال کی محنت ہے یہ میرے پیٹ میں اس
 دن کو نہ سویا تھا یہ میرے گھر میں اُس وقت کو نہ کھایا تھا کہ بد نصیب ماں مظلوم
 لال کو مرقی دفعہ پیسہ سے داغ کر رخصت کرے“ اُستانی کے قدموں میں ڈو پٹہ سانس
 کے قدموں میں سر شوشہ ہر کے قدموں میں خود ہاتھ جوڑ کر کہا گر گر اگر گر کر کہا شوہر
 پر التجا کا رگر ہوئی مگر اُستانی کی عیاری آجان کے دل پر جم چکی اور ان کا اصرار
 بدستور تھا کہ دروازہ سے آواز آئی ڈولی اُتر دالو، آبیوالی بیوی کی صورت دیکھتے
 ہی اُستانی کے ہوش اُڑ گئے اور سٹ پٹا کر کہا ”سیگم صاحب آداب“
 آبیوالی ”وعلیکم السلام۔ کیوں یہاں کیسے گزر رہو کیا یہ بچہ بھی مسان میں دبا ہوا؟
 اُستانی کھڑی تو صورت دیکھتے ہی ہو گئی نفیس مگر سلام کے جواب میں یہ سنا
 تو برقع سبھال صرف اتنا کہا ”جی نہیں اُن کے کئی آدمی جا چکے تھے۔ اس لئے
 حاضر ہو گئی“

جواب تو اُستانی صاحبہ نے دیدیا۔ مگر چہرے پر ہوا سیاں اُڑ رہی تھیں
 آبیوالی نے کرک کر کہا ”یہ مکاری کب تک اور یہ عیاری کہاں تک اب تم
 جیل خانہ جاکر ٹھیک ہو گئی“

اُستانی ”نہیں سیگم میں نے تو اب قسم کھالی ہے“

آبیوالی ”ان فریبوں سے کیا فائدہ جاؤ غارت ہو نکلو“

اُستانی تو اس طرح بھاگیں جیسے لاجول سے شیطان۔ ان کے بھاگنے سے

میری جان میں جان آئی، آنیوالی نے اس میری طرف دیکھا اور کہا ”کیوں بی بی آج آپ کا بچہ کیسا ہے؟“

میں اس بی بی سے مطلق واقف نہ تھی اور تعجب یہ تھا کہ ماں جان بھی، تاہم جب انھوں نے بچہ کو پوچھا تو میں نے کرایہ یا ہر بچے کا قصد کیا۔ انھوں نے منع کیا اور کہا ”جی نہیں ہم عورتوں میں یہ رسم بھی کہ آنیوالے کرایہ اپنے پاس سے موت کے وقت دیں ورنہ ہر حال میں صاحب خانہ سے دلوائیں کیونکہ وہ ہم آتا ہے پسندیدہ نہیں آنے کی خواہش میرے دل میں پیدا ہوئی ذمہ دار میں ہوں آپ پر کیوں پڑے یہ تو خواہوا کی سزا دینی ٹھہری جس شخص کو نقصان پہنچانا چاہا گاڑی کر آدھے اور کرایہ کی ہتیا دیدی۔ کرایہ دیدیا جائیگا آپ فکر نہ کیجئے ہر بانی فرما کر ذرا بچہ دکھا دیجئے اب کیسا ہے؟“ میں خاموش تھی انھوں نے آگے بڑھ کر بچہ دیکھا اور پوچھا ”کیا پلایا اور کیا لگایا“ ماں جان نے کہا ”ابھی تو گھڑی کی چھٹی پٹی ہو رہی ہے“ آنے والی بیوی اُسی وقت ٹلی میں بیٹھ اٹھی گئیں اور پتھوڑی دیر بعد پیٹنے لگی اور لگانیکی دوالائیں اور اپنے ہاتھ سے پلا لگا میرے پاس ہو بیٹھیں۔

فرشتہ اور حوریں تو یہی کہوں گی قربان کتے تھے اس بی بی پر اس نے ماں کی شفقت اور بہن کی محبت سب بھلا دی۔ بچہ کو گود میں لیا مجھ کو تسکین دی اور دن بھر دوائی ٹھنڈائی کرتی رہی، چار بجے ہوئے جس وقت اُس نے نماز عصر کا وضو کیا ہے تو میں نے دیکھا کہ ہاتھ جلا ہوا ہے! یہ وہی بی بی تھی جو اُس رات کو میرے ساتھ بھرکتے ہوئے شعلوں میں گھسی! میں اس قدر منجیر تھی کہ زبان اُلٹ نہ سکتی تھی خاموش اس کا منہ تک رہی تھی۔ ہمدردی جو آدمیت کا سبق اول ہے غلوں جو انسانیت کا عین منشا ہے صداقت جو اسلام کا بہترین جوہر ہے۔ اس کی بات بات اور گ رگ سے ٹپک رہا تھا۔ میرا منہ نہیں کہ اس کی تعریف۔ ممکن نہیں کہ اس کا

شکر یہ ادا کر سکوں، اس نے آگ میں کود کر میری مانتا ٹھنڈی کی ظالم اُستانی کے پنجہ سے میرا لال نکالا، خدا کی عنایت دیکھو کہ اس کے ہاتھ میں برکت دی، نیت میں صداقت تھی، محنت نیک لگی، بچہ گھنٹوں اور گھڑیوں لمحوں اور لمحوں میں تند و تیز ہوتا گیا۔ تم یقین کرنا کہ میری آنکھ رات کو لگ گئی۔ مگر اس نیک بخت نے پاک سے پاک نہ بھیکائی، پچھلے پہر جب میں اُٹھی ہوں تو بچہ کی حالت میں زمین و آسمان کا فرق تھا بخار بہت ہلکا تھا، ہوش درست تھا اس ٹھکانے میں نے بچہ کو گلے سے لگایا اور چاہتی تھی کہ ٹخنہ کے قدموں پر گروں، میرا دل بھرا آ رہا تھا اور یہ کہتی تھی قربان ہو جاؤں ان قدموں پر، آنکھوں سے لگاؤں یہ پاؤں میں آگے بڑھی بے اختیار ہو کر لپٹی، میرا دل کمزور میری حالت خراب اور میری طبیعت بیٹھی جاتی تھی اس قدر روئی کہ بچہ بندھ گئی، اس نیک بیگم نے مجھ کو چھاتی سے لگا لیا میری کتھا سُنی اور کہا ”شوہر کی ہو یا ساس کی خدمت میں فرق نہ آنے دینا اور یاد رکھنا کہ اطاعت کے بیچ ایسے پھول ہر شکر مکیں گے جن کو فنا نہیں“ میں نے کہا۔

”آپ کا نام کیا ہے، مسکرائیں اور کہا ”تم کو اس سے کیا کام اگر پھر کبھی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں نسیم کا گھر پوچھ لینا“ اس نام کی شہرت تمام شہر میں تھی ششدر رہ گئی، موذن اذان دے رہا تھا کہ اس نے بچے کو پیار کیا اور کہا ”اچھا بیوی ہمارا بچہ تم کو مبارک ہو خدا تمہاری مانتا ٹھنڈی رکھے دعا کرنا کہ میرا بچہ اچھا ہوا ال بھی مجھ سے ملے“ اتنا کہ نسیم بیگم آنکھ سے اٹھل ہو گئیں اس واقعہ کے بعد کوئی

آفتاب میرے سر پر ایسا طلوع نہ ہوا اور نہ کسی رات نے میرے سر پر ایسا سایہ ڈالا کہ اس کا خیال میرے دل سے فراموش ہوا اور میری ساس تھوڑے روز بعد دنیا سے رخصت ہوئیں مگر میں نے آخر وقت تک اُن کی اطاعت میں فرق نہ آنے دیا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہی شوہر جو ماکی زندگی میں کبھی سیدھے منہ بات تک نہ کرتا تھا میرے مرض الموت

میں تختیاں کھاتا تھا۔ نسیمہ بیگم کی خدمت سے میرا بچہ موت کے منہ سے چھٹا اور ان کی نصیحت نے شوہر کو جیتنے ہی میرے قدموں میں ڈلوایا اور مرنے کے بعد میرے صبر اور شکر کا یہ انعام مجھے ملا کہ اس جنت الفردوس میں جہاں کسی کو کوئی خواہش نہیں میری ایک التجا قبول ہوگی۔ یہ وہ وقت ہے کہ نسیمہ بیگم کی پاک روح اس کے مبارک جسم سے جدا ہوتی ہے دنیائے حیات کی لاتعداد ہستیاں اس کی زندگی سے مستفید ہوئیں ضرورت ہے کہ عالم بالا کی تمام جنتی روہیں اس وقت سجدے میں بیٹھیں اور درگاہ الٰہیہ میں گڑ گڑا کر عرض کریں کہ نسیمہ کی پاک روح جس وقت تنہو ملیحہ ہو تو وہ نسیمہ جس کی صورت کو ترستی آواز کو پھرکتی ہوئی ما دنیا سے وداع ہوتی ہے کلیجہ سے چمٹ جائے۔“

فرشتہ موت کی تیوری پر بل آگیا اس نے عورت کی روح کو جھڑک دیا اور کہا ”تو مگر بھی دنیا کے جھگڑوں سے نہ چھوٹی اور آج تک وہی خیالات تیرے باغ میں چکر لگا رہے ہیں، تجھ کو معلوم ہے یہ آخرت دنیا کی کھیتی ہے یہاں ایک ایک ذرّہ کا عذاب و ثواب ملتا ہے جس عورت کا ذکر تو کرتی ہے وہ تیسری سفارش اور عنایت کی محتاج نہیں، اس نے اپنی زندگی میں خدا کی پوری رضا مندی حاصل کی موت اس کی نکالیف کا خاتمہ اور فرحت کا آغاز ہے تو کھڑی رہ اور دیکھ اس کی روح کا داخلہ قصر نسیمہ میں اس طرح ہوگا کہ نسیمہ اس کی گود میں اور نسیمہ اس کے ساتھ!“

(۳۳)

بزم طرب کی اس شمع منور کی مانند جو رات کے آخری حصہ میں جب حاضرین مجلس ایک ایک کر کے رخصت ہوں اور سامان عیش بھیکا پڑنا شروع ہو جائے جھللا جھللا صحبت شب سے وداع ہوتی ہے، نسیمہ پر جس وقت مرض الموت کی بیہوشی طاری

ہوئی اور دماغ نے یاد و سیم کے سوا تمام تعلقات کو خیر باد کہا اور خیال کی تمام قوت اسی لال کی طرف ڈھل گئی، جس کی تصویر کھاتے پینے سوتے جاگتے آٹھوں پہر دن رات آنکھ کے سامنے رہتی تھی، تو کانوں نے شوہر کے آخری الفاظ سنے اور زبان نے یہ جواب دیکر کہ ”میرے لال کی روح میرے استقبال کو آئی“ میں اکیس سال کے واسطے کو جو بالآخر فنا ہونے والا تھا ختم کر دیا۔ اب ان بچیوں کے پھل جو دنیا میں بوئے ان معاملات کے نتیجے جو تعلقات میں برستے ان کاموں کے انجام جو زندگی میں کئے رو برو تھے۔ روح جس کی بدولت جسد خاکی اچھل کود رہا تھا رگ رگ سے وداع ہو رہی تھی پنڈلی سے پنڈلی لیٹ رہی تھی ہاتھ سے ہاتھ چمٹ رہا تھا اور موت جس کو زندگی بھول کر یا دہنیں کرتی اس ہمیں کپڑے کی طرح جو خار دار جھاڑی پر ڈال کر گھسیٹا جائے جسم سے جان نکال رہی تھی۔ کتنا نازک وقت تھا کہ بچے جو باکے نام کے عاشق تھے معذور کھڑے اس کا دم و پسین اور شوہر جو بیوی کی صورت کا پروردانہ تھا مجبور بیٹھا اس کی مفارقت ابدی دیکھ رہا تھا۔ گھر کا کونہ کونہ اور زندگی کا ذرہ ذرہ آواز بلند صدوے رہا تھا کہ کوہِ پتہ کی آدائش اور سسرال کے امتحان کا بیجہ آج برآمد ہوتا ہے۔ زندگی فنا ہوتے ہی کانٹوں سے پٹا میدان یا پھولوں بھری عینیں پیش کر دے گی۔ اور یہ راحت ابدی یا مستقل عذاب دوسروں کے واسطے عبرت یا سبق بن کر چند لمحہ میں ختم ہو گا پیشانی پر بل آئے اذیت کی آوازیں نکلیں مگر یہ عارضی تکلیف قطع تعلق کا اثر تھا روح پرواز کرتے ہی دیکھتی کیا ہے کہ دونوں کلیجہ کے ٹکڑے نسیم اور وسیم جن کے مکھڑوں کو آنکھیں ترس گئیں بقیں اور جو سفید کفن میں پیٹے لیٹائے مکی آنکھوں سے رخصت ہوئے تھے جھلا جھلی کے کپڑے پہنے ہشاش بشاش گردن جھکائے کھڑے ہیں۔ آنکھیں جن صورتوں کو تلاش کرتی بقیں دل جن پیادوں کو ہر جگہ ڈھونڈھٹتا پھرتا تھا۔ جو آنکھوں کے سامنے جا ندا سے بچان ہو کر گہری

گوروں میں سوچکے تھے۔ جن کی ہڈیاں تک گل کر خاک ہو چکی تھیں۔ جن کی قبریں تک دھنسنی شروع ہو گئی تھیں۔ ان کا اس وقت نظر آنا موت کی پہلی کامیابی تھی! ٹھنکی اور گرم سم کھڑی ہو گئی کہ ملک الموت نے کہا۔

”خالق کے احکام کو پیچھے دل سے بجالانے والی مخلوق تیرے لال موجود ہیں“

بیناب ہو کر آگے بڑھی نسیمہ دوزخ کے ماگے قدموں میں پسٹا اور وسیعہ نے اپنی گردن ماگے سینہ سے لگا دی، دونوں کو کلیجہ سے لگا لیا اور سچے میں گر پڑی۔

اب فرشتہ موت آسمان کی طرف اڑا نسیمہ قدم قدم پر خدا کی رضا مندی کے آثار پا رہی تھی وہی درو دیوار جو قبل از رحلت اس کی موت پر آٹھ آٹھ آنسو روہے تھے اس وقت مبارک بادیں سرگرم تھے پھولوں نے اس کی زندگی سرائی پتوں نے اس کے اعمال سنائے بلبل نے اس کے کام پر وجد کئے اور طوطی نے اس کے نام کا کلمہ پڑھا، چشمِ زدن میں یہ منظر ختم ہوا اور اب وہ وقت آیا کہ نسیمہ بیگم کی پاک روح خالق الموجودات کے حضور میں حاضر ہو، لطیف روح، غسل کی محتاج نہ تھی ایک حور سامنے آئی اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور رضائے باری کا ایک بیش بہا ٹھوکر اس کے ماتھے پر لگا اٹھے قدموں پلٹ گئی، اب فرشتہ موت جگمگاتی روح کو لئے ہوئے دوسرے مقام پر پہنچا یہاں حوروں کی صفیں قطار در قطار استقبال کو موجود تھیں سب نے بالاتفاق خوش آمدید کا نعرہ لگایا، ایک ممتاز حور سامنے آئی اور سرے پاؤں تک ہیرے اور جواہرات کے زیور پہنانے شروع کئے وہ پہناتے وقت باواز بلند ہوتی تھی کہ یہ جڑاؤ گلو بند شو ہر کی رضا مندی کا صلہ ہے اور ہیرے کے کنگن اس لئے ان ہاتھوں میں پہنائے جاتے ہیں کہ یہ اپنے جسم سے زیادہ مخلوق کے کام آئے والدین کی فرمانبرداری اور بزرگوں کی تعظیم کا انجام یہ موتیوں کی مالا ہے حور کے اس اعلانی پر باقی ماندہ گروہ مبارک مبارک کی صدائیں دیتا تھا اور خاموش ہو جاتا تھا

(۴)

وسیم کی موت کے بعد اس کی بیوی وسیم دھن کو اپنے ہاتھ سے دلہن بنا کر حقیقی
 اموں زاد بھائی عادت سے نکاح کر دینا حق یہ ہے کہ نسیم ہی جیسی نیک بی بی کا کام تھا،
 ہم جہاں تک اس معاملہ پر غور کرتے ہیں نسیم کا یہ انتخاب لاریب لا جواب تھا، عادت
 کی بیوی - مری وسیم دھن کا شوہر مرادو بچوں کا باپ وہ - دو بچوں کی نایہ پانچ چھ
 سال بیوی والا وہ رہا - چھ ساڑھے چھ سال وہ سہاگن رہی، پوری جوڑا اور برابر کی
 ٹکرت تھی، یہ مرنے والی نسیم کا رحم اور کرم تھا اس نے اپنے بچوں کا بوجھ پرائے سہرنہ
 ڈالا اور ہر کی پوری جائداد اپنے بچوں کا حق کاٹ بن باپ کے بچوں کو دیدی وہ اچھی
 طرح سمجھتی تھی، اور سمجھتی کیا تھی کہ یا کھلے خزانے کہا اور علی الاعلان کہا اس وقت جب
 بہو کو پالکی میں سوار کیا، کہ جائداد ان بچوں کی پرورش کے واسطے ہے مگر اس کی ذمہ
 وہ نہ ہم بلکہ خود مسلمانوں کی خدائی خوار قوم کہ بادشاہ اور مرز و رستم بدد جو ہے وہ
 نور علی نور عادت بے ایمان اگر ایمان سے کام لیتا تو وسیم دلہن اس کے
 واسطے حور تھی صورت میں شکل میں عزت میں آبرو میں روپیہ پیسہ میں عادت کی ساری
 کمالات ساڑھے روپیہ کی ملازمت، وسیم دلہن لائڈ ہو کر بھی بیسی ہزار کا زیور اور
 پچیس ہزار کی جائداد رکھتی تھی - کجنت اگر خدا عقل دیتا تو ایسی بیوی کے پاؤں دھو دھو
 کر دیتا، وسیم کے معصوم بچے جن کو بے ضیاع دادی مرتے مرتے کلیجہ سے چمٹائے دنیا
 سے رخصت ہوئی سوتیلے باپ کی گھر کی رونق اور خاندان کی ناک تھے - نسیم کی آنکھ بند
 ہوتے ہی ظالم طوطے کی طرح وید سے بدل گیا - نسیم جتنی بیوی تھی اپنی زندگی میں مٹے
 ہوئے اسلام کی شان دکھا گئی اور نہ سمجھ سکی کہ مسلمان سب گنوں پرورے کوئی نہ
 کہولند و رے بیوہ بہو کا خود نکاح کر دینا آسان کام نہ تھا دل پر جو گزری وہ اسی
 کا دل جانتا ہوگا - مگر خدا کے اور رسول کے ارشاد میں فرق نہ آنے دیا - لیکن ضرورت

یہ تھی کہ بیوہ کے بچے دادی کے پاس رہتے یا نانی کے اور پھوپھی کے یا خالہ کے اس مائے
 پاس رہنا جو دوسرے شوہر کی بیوی ہے کھلی ہوئی تنہا ہی اور علانیہ بریادی تھی
 ہم اس تمام مصیبت کا ذمہ دار وسیلہ دلہن اور صرف وسیم دلہن کو قرار دینگے
 نکاح کیا خوب کیا درست کیا بجا کیا، کیا کرنا چاہئے اور ضرور کرنا چاہئے اس کے اصرار
 سے مائی مجبوری سے باپ کی زبردستی سے الغرض خوشی سے یا جبر سے مگر کرتی یا ہوتا
 اس سے جو نام ہی کا مسلمان نہیں کام کا بھی ہو دیدے ہی کا نہیں عقیدے کا بھی
 سب سے پہلا کام بچوں کا انتظام تھا یہ صحیح کہ معصوموں کے سر پر باپ کا سایہ نہ
 رہا تھا۔ مگر باپ کو رونے والی ماں ابھی زندہ تھی اُسی کی آگ تھی کہ پیٹ کے بچوں
 کا حق قربان کیا اور اُن کی روٹی کا سہارا کر گئی نگوڑی نہیں ناٹھی نہیں پورا کسبہ
 موجود تھا بچے دودھ پیتے نہیں خاصے چار چھ برس کے تھے اور چار پانچ برس آنکھ
 بند کر کے گذر جاتے بیوی کے زیور کو تو عادت نے اول ہی دن سے اپنی ملکیت سمجھا خیر یہاں
 تک چندان مضائقہ نہیں مگر بچوں کی جائداد بھی حلوائے بے دودھ تھی اور شروع ہی
 سے اس فکر میں تھا کہ کسی طرح یہ ہتھیاؤں لبظاہران کا دیوانہ تھا اور بیوی کے دل میں
 گھر کرنے کی اس سے بہتر تدبیر اور کیا ہو سکتی تھی نکاح کے پہلے ہی سال کئی موقعوں
 پر کوشش کی کہ کسی ترکیب سے یہ بھگڑا پاک کرے۔ مگر ادھر نسبہ کی زندگی سر پر پورا
 انکس تھی ادھر خود بھی کچھ ہمت نہ پڑتی تھی اور سب سے بڑی بات وسیم دلہن کی
 نیت تھی، دنیا آخرت کی کھیتی ضرور مگر یہاں کے بیج یہاں بھی پھل لے آتے ہیں
 اگرین باپ کے بچے عادت کے گھر میں موجود تھے تو بن ماں کے بچے وسیع
 دلہن کے سپرد بھی، چاہئے تھا کہ اں بنکر آئی تھی ماں بنکر رہتی اور مائی محبت سے
 ننھے ننھے دلوں نے بھلا دیتی اور دکھا دیتی کہ سوتیلی مائیں پرائے پیٹ کے بچوں کو ما
 سے زیادہ سمجھتی ہیں جب تک اس کی نظر میں محبت اور رحم سے بھری ان بچوں

پر پڑیں خدا اس کے بچوں کا نگہبان رہا مگر جب نضایت نے محبت کو عداوت اور چاہ کو
سو تیا ڈاہ بنا دیا غریب بھوکے پیاسے پڑنے اور پیٹ پرانے پہننے لگے تو خدا کا غضب
سعیبت بن کر ایسا نازل ہوا کہ کلیجہ مسوس رہ گئی بات صرف اتنی تھی کہ عارف کا
چھوٹا لڑکا فادوق چھری ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ سلیمہ و سیدہ کا لڑکا دیکھ کر چلا
اور لوٹنے لگا کہ چھری لو لگا چھری عارف کی بھی نہیں فاروق کی مری ہوئی مائی تھی
سلیم کی صند دیکھ کر وسیم دہلن آپے سے باہر ہو گئی اور فادوق سے بگڑ کر کہا "وہ
کیوں نہیں دیتا۔ انا جہاں ہے۔ دیکھ نہیں رہا بچہ زمین میں لوٹ رہا ہے" اپنا پوت
اور کا ڈھینگرا یہ مثل اس وقت اصل تھی مشکل سے فادوق تین چار مہینے سلیم
سے بڑا ہو گا مگر وسیم دہن کی رائے میں اپنا بچہ بچہ تھا اور وہ بوڑھا فادوق یہ صحیح
کہ زندہ باپ کا بے وارثا بچہ تھا اور اس کو حق نہ تھا کہ سوتیلی مائی دہلیز پر
عدول حکمی کرتا۔ مگر بچہ تھا نہ سمجھ سکا کہ بد نصیب مائی شفقت سے محروم ہے اور
مرنے والی کی موت بچپن کی تمام صندیں ختم کر گئی، منہ پھلا کر کھڑا ہو گیا۔ اور چھری نہ
دی۔ یہ وہ منظر تھا کہ وسیم دہن اگر مسلمان ہوتی تو نہی سی جان کو کلیجہ سے لگا لیتی
فادوق چھری کا پلٹا مٹھی میں بھینچے کھڑا تھا کہ ڈائن ناگن کی طرح پھینھاتی اٹھی او
منہ پر ایک تھٹر دے دستہ اس اندر سے کھینچا کہ چھری معصوم کی چاروں انگلیاں
ہو لہان کرتی باہر نکلی! بچے نا سمجھ ہوں یا بھولے اور صندی ہوں یا فیلی مگر
ان کی ہر شرارت کی وجہ اور صند کا سبب صرف ناز برداری ہوتی ہے کسی
لاڈلے بچے کے تھٹر تو کیا پھانس لگ جاتی تو قیامت برپا کر دیتا۔ مگر فادوق لاکھ
بچہ تھا لیکن فطرت اس کو سمجھا رہی تھی اور واقعات بتا رہے تھے کہ پسینہ پر خون
مگرانے دالی قبر میں جاسوئی اور اب کوئی خون پر بھی افسوس کرنے والا نہیں اس
نے پہلے اپنے ہاتھ کو دیکھا کہ خون دھل دھل پہ رہا ہے اور اس کے بعد سوتیلی

ماکو گر بچہ سہم کرو ہم گیا، جب یہ دیکھا کہ میری انگلیوں سے زیادہ اس قصائی کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ اپنی تکلیف بھول خون میں بھری انگلیوں سے ہاتھ جوڑ کر سامنے کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔

”ابھی اب نہیں۔“

فادوق کا بڑا بھائی صدیق جو اس سے ڈیڑھ برس بڑا ہو گا سو تیلی ما کے غصہ سے الگ کھڑا کھڑا کھڑا کانپ رہا تھا جب وہ سامنے سے ہٹ گئی تو بھائی کا خون دیکھ کر خون کے جوش نے بیتاب کر دیا، اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گیا، ہر چند ہاتھ دھلایا مگر زخم کاری تھا خون نہ تھا۔ دونوں باریصیب گلی میں بیٹھے حسرت سے ایک دوسرے کی صورت کو تک رہے تھے کہ وسیع دہن کی آواز کان میں پہنچی۔ دے دے پاؤں ڈرتی ہوئی صورت اور بھولی آنکھوں سے اندر آئے عارف کے آنے کا وقت تھا اس خیال سے کہ خبر نہ ہو جائے دونوں کو باور چچا نہ میں بٹھا کر حکم دیدیا کہ اگر یہاں سے ہلے تو کھال اڑا دوں گی“

بھولی گئی یا جان کر خدا جانے یا وہ جانے کڑکڑاتے جاڑے اور چلے کی سردی میں وسیع دہن، اس کے پیچھے، عارف بگرم بھونپوں میں بھیجے سوتے تھے اور بن ما کے دو پیچھے باور چچا نہ میں سوں سوں کرتے اکر رہے تھے!

وسیم دہن کی یہ سنگدلی ایسی نہ تھی کہ خدا کا غضب جوش میں نہ آتا اور فادوق کا حقیقی وارث معصوم کی حمایت کو نہ اٹھتا۔ بہتری اور بدتری دونوں حالتوں کا انحصار اسباب پر ہے، عارف کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ ایک معمولی سا ٹھہرو بیہ کا اہلکار چالیس پچاس ہزار کی مالیت پر قابض اور وسیع کی بیوی کا مالک ہو گا۔ وسیع دہن اس کے وسطے نعمت غیر مترقبہ تھی، اُس نے ابتدائیں بیوی کی جو قدر و منزلت اور الفت و محبت کی اس میں صرف ایک سجدہ باقی تھا۔

وسیم دھن اگر سمجھا رہی ہوتی تو اس محبت کو ترقی دیتی اس تعلق کو مستحکم کرتی اور اس فریفتگی کو استوار کرتی۔ مگر تقدیر دوسرے سامان پیدا کر رہی تھی، میاں کی محبت پر پھول کر سب کچھ بھول گئی، اس تغافل کا نتیجہ یہ ہوا کہ عادت کو بیوی سے جو توقعات تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں، لاکھ ایک چھوڑ دو دو مائیں آگے موجود تھیں مگر اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ خانہ داری کا انتظام مائوں کے سپرد ہو اور بیوی دن رات پلنگ پر اینٹ دتی اور آسینہ کے آگے منگتی رہے بارہ مہینے کی بیماریاں دن کی روگی ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ وسیم دھن سچی تھی، مگر سوچتی اور سمجھتی کہ عادت انسان ہے فرشتہ نہیں بیماریاں تو نادم ہوتی مجبور تھی تو اعتراض کرتی یہ کیا کام کے قابل نہیں انتظام کے لائق نہیں، شوہر بھوکا پیاسا لقمہ کرتا دفر جا اور آ رہا ہے۔ مائوں نے جیسا چاہا اور جیسا ہو سکا بھون بھون آگے رکھ دیا کبھی نمک زہر اور مرچیں ہلاہل اور میاں بیوی بجائے افسوس کے زبان سے کچھ کے اور طعنوں کے چرکے دیئے چلی جا رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا اور ہونا چاہئے تھا کہ ایک دو ہی سال کے اندر عادت نے اور نکاح کر لیا یہ عقلمندی بھی وسیم دھن ہی کی تھی۔ مخالفت کی جوان لڑکی گھر میں موجود تھی۔ بیوی نے میاں کے کھانے پینے کپڑے لٹے کا تمام کام اس کے سپرد کیا، انخام جو ہونا تھا وہ ہوا، اب البتہ وسیم دھن کی آنکھیں کھلیں مگر بے سود اب پھپھٹائے کیا ہوت ہے جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ مرض ختم بیماری رفلو چکر اور لاپرواہی ہوا ہوتی۔ ہوش آ یا مگر بے وقت سمجھ آئی مگر دیر میں:

یہ وہ وقت تھا کہ ہاتھ تنکے والی۔ ہاتھ باندھنے والی، ہاتھ جوڑنے والی نشتر برابر کی سوکن تھی، وسیم دھن اس کا رنگ دیکھ دل ہی دل میں ٹھنٹی انگاروں پر لوٹی مگر اس کا خدا اس کے ساتھ تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دولت

دیکھ کر اچھری نہیں اور بیوی بنگرے گڑی نہیں دب کر رہی اور گر کر ملی :-
 کم حیثیت تھی تو ہو راجہ کے گھر آئی رانی کہلائی، جو کام کیا پورا کیا جو فرض
 تھا وہ ادا کیا۔ بیوی بنگرے آئی اور لونڈی بنگرے رہی، خدمت میں کسی نہ کی اطاعت
 سے منہ نہ موڑا، محبت میں کسر نہ کی، عنایت میں دقیقہ نہ چھوڑا، ضرورت سے زیادہ
 آسائش توقع سے بڑھ کر آرام اور امید سے سوا خوشی پہونچائی، انجام روشن
 نتیجہ ظاہر اور معاضدہ صاف تھا۔ عادت ایک سال ہی بھر میں نسترن کا کلمہ
 پڑھنے لگا۔ خدا کی شان تھی وہی وسیم دلہن جو عادت سے سیدھے منہ بات نہ کرتی
 تھی آج گھنٹوں رستہ میں کھڑی رہتی وہ آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا۔ کسی دفعہ ارادہ کیا
 کہ پرچہ لکھ کر دوں مگر اتنا موقع بھی نہ ملا۔ نسترن کے اشتیارات روز بروز وسیع
 تھے۔ جس کو پیسا چاہے وہی سہاگن۔ کل کلاں مختار وہی تھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ وسیم دلہن
 کو جو کچھ نسترن ہاتھ اٹھا کر دیدیتی وہ کھا لیتی جو پہنا دیتی وہ پہن لیتی، یہ جو کچھ
 بھی تھا بد محبت کے اپنے کو تیکوں کا نتیجہ اور گنوں کا پھیل ابھی تک قدرت نے اس
 کو اپنی طرف سے کوئی سزا نہ دی تھی :-

ماکی بدولت دونوں بچوں کی مٹی بلید ہو رہی تھی۔ عادت جو بیوی کی محبت کے
 زمانہ میں ہمیشہ یہی سوچتا رہا کہ کسی طرح ان کا مال ہتھیائوں اب کہ بیوی کے نام
 سے نفرت تھی بچوں کا جیسا بھی دشمن ہوتا کم تھا و دفعہ کوشش کی کہ دونوں کا
 خاتمہ کر دوں مگر دونوں دفعہ ناکام رہا۔ سات سال آنکھ بند کر کے گزر گئے مگر
 اذکار کی منتوا تر بھر مار سے وسیم دلہن کا اب صرف ایک ڈھانچ باقی تھا جو کسی
 وقت سر سے پاؤں تک گوندنی کی طرح زیوریں لدی تھی اب اس کے پاس چاندی
 یا تانبے کا تار تک نہ تھا۔ میلے چکٹ کپڑے لونڈیوں کی طرح دن رات ایک کونہ
 میں پڑی رہتی۔ سو کن اس کی چھاتی پر سونگ دیتی، عادت اس کے سامنے ٹھٹھے

لگتا، میاں بیوی اس کے روبرو سنتے بولتے کلیجہ پر سانپ لوٹاؤں میں ہو کر اٹھتی، طبیعت میں جوش آتا، مگر سانپ کی طرح سر دھتی اور چُپ ہو جاتی۔ بھوک اُڑ گئی نیند جاتی رہی۔ راتیں اسی جھگڑ میں صبح اور دن اسی بیچ و تاب میں ختم ہو جاتے۔ اس وقت نسنائون بھی دوڑکوں کی مانند، اور گو عادت اور وسیم دہن دونوں کے دود و پچے موجود تھے۔ مگر جو دلالت اور انسانیت ان دود کے چہروں پر تھی وہ ان چار میں ایک کے بھی نہ تھی:

باپ کے بعد وسیم کے بچے جب تک دادی کی چوکھٹ پر رہے یا دادی زندہ رہی لالوں کے لال تھے۔ لسیہ کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ یقت ریر پھوٹی پہوا اپنے کوتلوں سے خود ہی نہیں بچوں تک کو براؤ کر دے گی، اب کہ بیوی سے لونڈی سیگم سے کیتز اور گھروالی سے بانڈی بن چکی تھی۔ نفس کی شرارت اور دل کی خباثت سے اس وقت بھی باز نہ آئی نہ یور کا بڑا حصہ پیروں اور ٹانگوں کی نذر ہوا اور صرف اس امید پر کہ کسی طرح سوکن اور اس کے بچے زندہ نہ رہیں۔ دیوالی دسہرہ کی یونین تو مستقل تھیں ہی۔ یوں بھی کوئی دن اس کوشش سے خالی نہ جاتا۔ سوکن رذیل تھی یا ذلیل مگر اپنی آنکھ سے دیکھتی کہ آج سیندرور لٹی کلیجی کل سوہیوں بھری سری انگنائی میں سے نکل رہی ہے مگر ہنس دیتی اور ٹال دیتی۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ وسیم دہن کی عقل میں فتور آ گیا تھا۔ مگر اس میں کلام نہیں کہ بعض دفعہ اسی چکر میں ایسی سخت غلطیاں کرتی تھی کہ تعجب ہوتا تھا بھلا یہ بھی کوئی بات تھی کہ نسنائون کے بڑے لڑکے ظہیر کی گبین گھر میں آ پڑی۔ گھنٹہ بھر تک دروازہ پر کھڑا وہ سر ہلکاتا رہا، چپکی بیٹھی بیٹھی رہی اور گنڈی نہ کھولی۔ خواہش تو عادت کے دل میں بھی پیو جو دھتی کہ کسی طرح وسیم کے بچوں کا مال اُٹاؤں، مگر اس کی اور وسیم دہن کی خواہش میں آسان وزین

کا فرق تھا وہ مہمتی تھا مال کا اور یہ ساعی تھی موت کی، پھر ایک بھی نہیں مین کی، عارف بد نصیب بیوی کی اس خواہش اور کوشش دونوں سے واقف تھا کئی دفعہ قصہ کیا کہ سزا دے۔ مگر واہ رے ناسترن کہنے کو تو مغلانی کی لڑکی تھی کمین کہو یا نیچ ذات مگر شریف زاد یوں کو مات کیا۔ ہمیشہ رو کا اور سدا سمجھا یا لیکن عارف کے علاوہ ایک اور طاقت بھی تھی جو وسیم دہن کے اعمال کو اچھی طرح پرکھ رہی تھی اور جو کسی صلاح یا مشورے کی محتاج نہ تھی۔

وسیم دہن کا بڑا لڑکا اسلامہ جو مال کی کوششوں میں برابر کا نہیں شریک غالب تھا اور اس کی اخلاقی حالت بد بخت ما کے ہاتھوں اتنی عارت اور برباد ہو چکی تھی کہ اٹھنے بیٹھنے سوتے جاگتے ہر وقت اسی ادھیڑ میں غرق رہتا تھا کہ کوئی تعویذ کوئی گناہ کوئی غلبہ نہ کوئی داؤ کوئی ترکیب کوئی کوشش کوئی موقع کوئی صورت ایسی ہو اور ایسا ہو کہ فادوق اور صمدیق ناسترن اور اس کے دونوں بچے پھٹکا نہ کھائیں اور سارے گھر کی حکومت اس کے قبضہ میں آجائے۔ خدا کی شان تھی کہ ناسترن کے دونوں بچے کڑکڑاتے جاڑوں میں نماز صبح کے وقت بستہ لعل میں لائے پڑھنے جائیں اور وسیم کا بچہ چودہ پندرہ برس کا ڈھنکوسی کامل فقیر کی تلاش میں سرگرداں رہے! یہ درست کہ وسیم دہن کی تقدیر پلٹا کھا چکی تھی مگر سوچتی اور سمجھتی کہ عمر ڈھل چکی بڑا حصہ ختم ہوا یہ دو بچے جو منہ والے شوہر کی یادگار اور عینہ ساس کی امانت ہیں ان کی زندگیاں برباد نہ ہوں خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اُس دادی کو جو بد نصیب بچوں کی روٹی کا سہارا چھوڑ مری اگر جانو رہا اُن کی تسلیم پر تو جہ کرتی تو لالوں کے لال تھے مگر محبت نے بھول کر بھی دھیان نہ کیا۔ آپ بھی دن بھر اسی ادھیڑ میں لگی رہتی اور بچے بھی دن بھر پیر فقیر کی تلاش میں مارے مارے پھرتے، شہر میں دفعۃً یہ خبر مشہور ہوئی کہ

ایک ولی کامل جہنما کی درگاہ میں آکر ٹھیرے ہیں کھانا پینا سب چھوڑ دیا صرف رات کے وقت آنکھوں پر کچے دودھ کا پی کر گزارہ کرتے ہیں۔ مگر کسی کی محال نہیں کہ وہاں تک جاسکے۔ بات چیت مطلق نہیں کرتے اسلام اس موقع پر کیا چوکنے والا تھا سنتے ہی ہینچا۔ دیکھتا ہے تو واقعی آدمیوں کا تانتا لگا ہوا ہے، مگر حضور تک کسی کی رسائی نہیں۔ پندرہ سئیس مسٹنڈے پڑی پڑی زلفیں نیچے نیچے کرتے، ہاتھ باندھے، مگر دنیوں جھکائے خاموش پہرہ دے رہے ہیں۔ ایک ہفتہ بھر کی متواتر ریاضت اور لگاتار محنت کے بعد باریابی ہوئی کامیابی شاہ صاحب کی زبان میں تھی اینٹھا جوا اینٹھا تھا گھسیٹا جو گھسیٹا تھا خلقت پر و انوں کی طرح سیرجی پر گری اور اس بھلے مانس نے بھی تاک تاک کے ایک ایک کو موسا۔ اسلام اب اکثر شاہ صاحب کی اردلی میں رہتا ہمارہ ایک بجے رات کو آیا اور پڑ رہا۔ صبح نماز کے وقت پھر جا پہنچا۔ طبابت فقیری کا شاید کوئی جہد ہے کہ پیر حکیم بھی ہوتے ہیں۔ ہمارے شاہ صاحب روحانی بھی نہیں جسمانی طبیب بھی تھے صبح کے وقت ایک روز ایک شخص ایک لڑکی کو گود میں لے حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آج سات رو سے بخاریں بھلس رہی ہے۔ دنیا بھر کے جتن کر ڈالے بخاریں سے مس نہیں ہوتا۔ کمزوری کا یہ حال ہے کہ آواز نہیں نکلتی، شاہ صاحب نے غور سے دیکھا اور فرمایا ”گلا آگیا ہے گلا“ اتنا فرما کر ایک مرید کی طرف اشارہ کیا وہ فوراً لڑکی کو گود میں لے باہر آیا اور ایک سفید رومال گلے میں ڈال گلا اٹھانے لگا بچہ بخاریں تو ہل ہی رہی تھی رومال میں بھی کانٹھ نہ معلوم کس رگ پر پڑی کہ لڑکی باتوں ہی باتوں میں ٹھنڈی ہو گئی۔ شاہ صاحب کی اس بیہودگی اور لوٹ کھسوٹ کا شہرہ دور دور پہنچ رہا تھا۔ مگر خلقت اس بھی بات کی نہ کہ نہ ہو سکتی۔ دوپہر کے وقت ایک ہندو سیٹھانی تین برس کا بچہ لے آئی اور کہا ”ڈاڈھ میں کیڑا لگ گیا انگریزی اور یونانی

شب زندگی حصہ اول ۴۴ از علامہ راشد الخیری

دونوں علاج کر چکی کہ ایک چنچ زمین ہے اور ایک آسمان "بچہ زیور میں لدرہا تھا۔ ایک شاہ صاحب کیا، جماعت کے منہ میں دیکھتے ہی پانی پھر آیا، اشارہ پاتے ہی ایک مرید آگے بڑھا اور بچہ کو بیکر دوسرے کمرے میں پہنچ بھٹ کٹیہا کے بیج جو دانتوں کے کیڑے کے واسطے مشہور ہیں ایک ہنڈیا میں ڈال اوپر سے آگ ڈال دی شاہ صاحب ہوشیار تھے یا آلو مگر مرید آلو بھی نہیں آلو کا پھٹا تھا کہ بچہ کا سر زبردستی ہنڈیا میں ٹھونسنا اور کہا دھوئیں سے کیڑے مریں گے۔ ہنڈیا چھوٹی سر بڑا! گردن پھنس گئی ہوا کا راستہ نہیں رہا دھوئیں سے دم گھسا ہر چند غریب ہاتھ پاؤں مار رہا ہے مگر گردن نہیں نکلتی اور مرید صاحب اوپر سے زبردستی گردن پکڑتے مسکنے نہیں دیتے۔ دم نکلتا تھا۔ نکل گیا مگر گردن ہنڈیا سے نہ نکلی، آدھ گھنٹہ سے زیادہ گذر گیا، بیج خاک آگ ٹھنڈی اور دھواں ختم ہوا تو مرید صاحب بہت سٹ پٹائے ہنڈیا توڑی تو بچہ کبھی کا اچھا ہو چکا تھا۔

ظالموں کو اس وقت زیور کی پٹری تھی، ماں کھڑی روپیٹ رہی تھی اور وہ سنگدل زیور کی ٹٹول میں! آنکھ بچا کر کڑے تیر کئے اور چپ ہو گئے، دونوں وارداتوں کی خبر پولیس کو پہنچی۔ شاہ صاحب کی غارت گری کا شہرہ تو مدت سے تھا ان خبروں سے باوجود یکہ کو تو ال شریف النفس تھا ضبط نہ کر سکا تماشائی لیتا ہے تو شہر بھر کی چوری کا مال موجود!

(۵)

نساتون کی چچا زاد بہن عائشہ ایک درزی سے بیاہی گئی تھی دو میاں بیوی اور دو بچے مزے سے رہتے بہتے تھے اتفاق سے شہر میں مہینہ پھوٹا اور اس شدت اور کثرت سے کہ گھر کے گھر صاف ہو گئے۔ ہر گھر سے رونے کی آوازیں بلند تھیں ہیا۔ وں طرف ایک کہرام مچا ہوا تھا، کیسے کیسے کرہیل جوان دیکھنے دکھانے

کے لائق دو دو تین تین گھنٹہ میں چٹ پٹ ہو گئے، وہاں کیا تھر خدا تھا جو بیضہ کی صورت میں نازل ہو رہا تھا وہ محسوساتی لاشیں نکلتی تھیں کہ دیکھنے والے لرز جاتے عائشہ تھی نو جوان اور جوان بھی کیا لڑکی لسنٹن سے چھ سات مہینے چھوٹی مگر آنکھوں کی مرضیں بچپن سے تھی کسی مکار نے میرا کہہ کر کثیر دیدیا دونوں آنکھیں چو پٹ ہو گئیں۔ درزی غریب معصوم بچوں کے ساتھ اندھی بیوی کو پال رہا تھا، شام کے وقت دوکان بند کر آٹا دال گھی ایندھن لے گھر آیا۔ آٹا گوندھا دال چڑھائی روٹی ڈال پکے کو دی، بیوی کو کھلائی آپ لیکر بیٹھا تھا کہ تھے ہوئی ایک ہوئی دو ہوئیں تین ہوئیں آنکھیں بند ہو گئیں دست شروع ہوئے صبح تک تمام بدن اولا تھا۔ جب زندگی کی کوئی امید نہ رہی اور تشنخ شروع ہو گیا تو بیوی کو اپنے پاس بلا کر کہا

”میں اب گھڑی آدھ گھڑی کا ہمان ہوں، بچے تمہارے اور تم خدا کے

پھر وہو میرا کہا سنا معاف کرنا“

اتنا کہ درزی رخصت ہوا عائشہ آنکھوں سے معذور تھی، ہاتھ سے مٹولا تو نبض تھی نہ سانس، دن ایسے کہ سب کی جان ست ہی ست پر تھی، حالت یہ کہ گھر میں تابنے کا برتن نہیں محلہ والوں نے مل جل کے مرنے والے کا گور گرہا کیا۔ ہم اہل محلہ کی ہمدردی ضرور قابل شکریہ خیال کرتے ہیں لیکن ایسے گھر میں جہاں دو ٹوٹی کھٹیوں کے سوا خاک نہ تھا، بیضہ جیسے متعدی مرض کی موت کے بعد خاموش ہو جانا یقیناً اسلام کی شان نہ تھی، مناسب تھا کہ اندھی ما اور معصوم بچوں کو نہلا ڈھلا اچلے کپڑے پہنا اس مکان سے علیحدہ کر دیتے مگر کون کرنا شام کو بڑے بچے نے بیضہ کیا۔ آنکھوں والی ماؤں کا اضطراب ایسے موقع پر جب دل تڑپتا اور کلیجہ نچتا ہے صورت دیکھ کر کم ہو جاتا ہے بیبتابی میں استکین

اور ناامیدی میں امید کی ایک جھلک دکھا دیتی ہے۔ مگر عائشہ کو اس یقین کے سوا کہ پانچ برس کی کمائی خاک میں مل رہی ہے کوئی امید تھی نہ ہوش، یقین کے ساتھ ہی وہ بچے سے لپٹ گئی اور اس وقت تک لیٹی رہی جب تک لوگوں نے ہنلانے کے واسطے علیحدہ نہ کیا!

اب اس گھر میں صرف عائشہ اور اس کا ایک ساتھی ہینہ کا دودھ پیتا بچہ تھا۔ آنکھوں کے صدمہ نے عائشہ کی جان پر بنا دی تھی شوہر کی موت نے یہی سہی مکر توڑ دی اور حجب پانچ برس کا لال بھری گود خالی کر گیا تو عائشہ انسان نہیں ایک مٹی کا کھلونا تھا جو قدرت کے اشاروں پر چل رہا تھا بچے کے میلے کپڑے ہاتھ میں ہوتے منہ پر رکھتی سو گنتی اور بلبلا تی، بیٹھے بیٹھے ایک ہوک اٹھی کھڑی ہو جاتی کپڑے پھاڑتی اور ٹکریں مارتی۔ آدھی رات کا وقت تھا ہوا درست ہو چکی تھی بیماری اٹکا دکا رہ گئی تھی اور خلقت کو بہت اطمینان ہو گیا تھا کہ عائشہ نے ہیضہ کیا کرنا تعجب نہیں نہ کرنا تعجب! ان گیز تھا کہ گھٹنوں مروے کو لپٹی رہی ہیضہ ہونا چاہتے تھا ہوا دوائی کیسی اور ٹھنڈائی کس کی باپ بیٹے کی خبر موت تو عائشہ پہنچانے والی موجود تھی کہ دونوں اول منزل ہو گئے اس کی خبر دینے والا صرف ایک شیر خوار بچہ بلکتا تھا، ہوائے معصوم کی آواز دور دور پہنچانے کی کوشش کی مگر دنیا بے فکر ہو کر نرم گرم بچھونوں پر پڑی تھی۔ کون اپنی نیند برباد کرتا۔ انجام جو باپ بیٹوں کا ہوا وہ اندھی عائشہ کا:

عائشہ کا مردہ بے گور و کفن ایک دن اور ایک رات مسلمانوں کے پڑوس میں پڑا رہا رات کے دس بجے ہو گئے کہ نثرین کو عائشہ کی بیوگی اور بچہ کی موت کا علم ہوا اس وقت ہمارے سامنے وہ موقع ہے کہ مارون الرشید بہلول دانا سے ملتی ہے کہ کچھ نصیحت فرمائیے بہلول خاموش ہیں اور مارون مُصر جب بہت

منت کی تو مسکراتے اور فرمایا "ہا دون مال اور جمال یہ دونوں دیکر خدا اپنے بندوں کو آزانا ہے سلطنت سے آج خوش ہو جا مگر کل کی نجات بڑی بھاری مصیبت سر پر لانے والی ہے" ناستون معمولی مثلانی کی لڑکی تھی جس نے آنکھ کھول کر سلامتی کی روٹی کھائی اور خیرات کے کپڑے پہنے مگر آج عادت کے گھر بار اور عادت ہی کے کیا سچ پوچھو تو عادت اور عادت کے بچوں اور ایمان سے کہو تو عادت عادت کے بچے و نسیم دہن اور اس کے بچے سب کی مالک وہی تھی۔ دستور دینا کے موافق جتنا اکثرتی اور جتنا پھیلتی سچی تھی۔ سیر کی ہنڈیا میں سوا سیر پڑا جو کرتی جائز تھا مگر حیرت ہوتی ہے کہ وہ پیتا اور وہ تہا جو کوارہ پتہ میں موجود تھا نکاح ہوتے ہی خاک میں مل گیا۔ عادت تو خیر سر کا سرتاج تھا جو کچھ بھی کرتی حق رکھتا تھا اس کے بچوں تک کے آگے ہاتھ جوڑتی اور رکھانے کھلاتی اور پھر یہ نہیں کہ دنیا دکھاوے یا میاں کے خوش کرنے کو گھر میں سوا بچوں کے اور کوئی نہیں اور وہ اللہ کی بندی پاس بٹھا کر چکار رہی ہے پیار کر رہی ہے منت کر رہی ہے خوشا مگر یہی ہے اور کھانا کھلا رہی ہے بچوں سے آگے بڑھ کر و نسیم دہن کو گو سوکن تھی اور کیسی سوکن جان کی دشمن اور خون کی پیاسی مگر پہلے اس کو اور اس کے بچوں کو کھانا بھیجنا اور پھر اپنے منہ میں ڈالنا مائتسا کے شوہر اور بچے کی خبر جس وقت پہنچی سونے کی تیاری کر رہی تھی، سنتے ہی بے چین ہو گئی اور ڈولی منگوا چلنے کو تیار ہوئی۔ ہم عادت کی طبیعت اس کی نیت اور اس کی عادت سے واقف ہیں اس کا منشا ہرگز نہ تھا کہ بیوی دیاں جاتے مگر وہ خود بھی بیوی کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا کھلم کھلا تو نہیں ہاں دبی زبان سے اس وقت کا جانا اس نے پسند نہ کیا وہ اگر صاف کہہ دیتا تو ناستون یقیناً نہ جاتی مگر چونکہ خود اسی نے چبا کر کہا اس لئے ناستون نے سنجیدگی سے عرض کیا "سرکار خدا آپ کے

سامنے مجھے زمین کا پیوند کرے مگر یہ حالت میری سدا رہنے والی نہیں مجھے کچھ وہاں کی کسائی بھی کر لینے دیجئے کام کا وقت یہی ہے جس نے مجھ کو یہ دن دکھایا ایک روز مجھے بھی اپنا منہ دکھانا ہے“

عارف بیوی کی اس گفتگو سے بہت خوش ہوا اور اجازت دی تو وہ ایک ماما ساتھ لے وہاں پہنچی۔ اندر جا کر دیکھتی ہے تو وہ منظر تھا کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے سات آنکھ ہینے کا زندہ بچہ مردہ ماں کی چھاتی پر لیٹا دودھ پی رہا تھا اور جب وہ دودھ نہ کھلتا تھا تو چیخیں مارتا تھا! استرہ اٹھا رہے تھے گاہک بھوکا روتے روتے اور چیختے چیختے آواز بڑھ چکی تھی ہونٹوں پر سیڑیاں بندھی ہوئی تھیں اور مصوم چند گھنٹوں ہی کا ہمان تھا۔ اس وقت جو کام نسنرن نے کیا قدرت اس کے احسان کا اعتراف ہمیشہ کرے گی اس نے ماما سے فوراً پانی گرم کروا بچہ کو نہلا دھلا گود میں لے اپنا دودھ اس کے منہ میں دے دیا یہ وہ وقت تھا کہ کیا آسمان اور کیا زمین کائنات کا ہر ذرہ اس کی تعریف کر رہا تھا ہر دے گول و کفن دے قبرستان پہنچا اور بچہ کو لے گھر پہنچی۔ عارف کی تیوری پر بل بھی آیا مگر اس نے کہہ دیا کہ ”جو خدا چھ بچوں کو دیتا ہے وہ ساتویں کو بھی دے گا“ عارف ساٹھ روپیہ کا معمولی ملازم تھا اتفاق دیکھئے کہ کلکٹر صاحب کو ایک شخص کی دورے پر ضرورت ہوئی عارف کا انتخاب ہوا وقت کی بات تھی صاحب اس قدر خوش ہوئے کہ اسی سال تحصیلداری کے لئے نامزد کر دیا اور ایک تین ہی ہینے میں شہر کے شہر میں وہ عارف جس کو پانچ روپیہ کی ترقی کے بھی لالے تھے دیرھ سو روپیہ کا تحصیلدار تھا۔

ہمارا عقیدہ سچا اور یقیناً سچا کہ عارف کی اس غیر معمولی ترقی کی وجہ جو اس کے کیا کسی کے بھی وہم و گمان میں بھی نہ آسکتی تھی محض نسنرن تھی اس نے

دکھا دیا کہ نیک بیویاں کس طرح شوہروں کو زمین سے آسمان پر پہنچا سکتی ہیں تحصیلداری کی پہلی تنخواہ ہاتھ میں آتے ہی اس نے ایک جلسہ منعقد کیا اور اعلان کر دیا کہ شہر کے تمام اپانچ و محتاج رات کا کھانا ہمیں کھائیں اسی سلسلے میں لگے ہاتھ چھوٹے بچہ کی بسم اللہ کر دی :

رات کے دس بجے جب وعظ ختم ہو چکا اور سنسٹون کے دونوں بچے زرق برق پوشا کہیں پہنے مائے کلیجہ سے آکر چمپے ہیں وہ سب سے پہلے سجدہ میں گری خدا کا شکر ادا کیا جس نے اس کو یہ خوشی کی گھڑی دکھائی۔ اس کے بعد دونوں بچوں کو ساتھ ساتھ لے تیم بچوں اور رانڈ عورتوں کی خاطر مدارات میں مصروف ہونی کا ایک اُس کی نگاہ ایک ایسے اپانچ بچہ پر پڑی جس کا صرف ایک ہاتھ تھا اور اس سے وہ اپنی آنکھیں ڈھانکے ہوئے تھا۔ بچہ نے کئی دفعہ قصد کیا کہ نوالہ توڑے مگر انھیں چونکہ دکھ رہی نقبیں روشنی کی جوت تیر کی طرح پڑتی تھی لوگ کھاپی کر اٹھ گئے اور جب کمرہ بالکل خالی ہو گیا تو یہ بچہ بھی خالی ہاتھ اُٹھا۔ اس بچہ کے ما اور باپ دونوں پچھلے سال طاعون میں مر چکے تھے سیدھے ہاتھ میں ایک ایسا پھوڑا نکلا کہ ڈاکٹر نے ہاتھ کاٹ دیا۔ بد نصیب بچہ کی عمر سات یا آٹھ سال کی ہوگی۔ جب اُس نے دیکھا کہ سب لوگ اُٹھ گئے تو ٹھنڈا سانس بھر بھوکا اُٹھا یہ سانس بظاہر معمولی تھا مگر سنسٹون نے اس کو پڑھا جس میں یہ جذبہ پوشیدہ تھا کہ دنیا میں لاکھوں اور اس مجلس میں بیسیوں مائیں موجود ہیں مگر کوئی ایسی ماں نہیں کہ مجھ بے مائے بچہ کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلا دیتی۔ سنسٹون اس خیال سے لرز گئی اور اس کی معصوم خواہش میں جو موجودہ تہذیب و تمدن کے اعتبار سے قطعاً ناجائز اور مسلمانوں کے کچہ کی مانتا والیوں سے یقیناً جائز تھی اس درجہ مستغرق ہوئی کہ بچہ آنکھ سے اوچھل ہو گیا مگر وہ بدستور محو رہی :

وسیم دلہن انگاروں پر تو ہر وقت لوٹ رہی تھی اس وقت نہ معلوم کس مہین میں باہر نکل کھڑی ہو گئی۔ بچہ چلنے لگا تو ہاتھ آنکھوں پر تھا، دیکھ نہ سکا کہ کوئی کھڑا ہے پاؤں وسیم دلہن کے پاؤں پر پڑا، کہو نسترے جو تیاں کچھ ہیں پتھری پتھری انگلیف کے علاوہ وسیم دلہن کی جوتی بھی حشراب ہوئی اور پاؤں بھی مٹی میں بھرا سخت غصہ آیا بچہ کی بغل میں رات کے اوڑھنے کا ایک چھتھر اکبل تھا۔ اس کے چہرے پر ایک تھپڑ اس زور سے مارا کہ بلک گیا۔ کبل کو دیکھ کر کہنے لگی ”کم بخت چور پیٹ کا پیٹ بھرا چوری کی چوری کی۔ پیٹ میں رکھا اور بغل میں بھی لے چلا“ تھپڑ پورے زور کا تھا بچہ بلک گیا اور کہنے لگا۔ ”جی نہیں دیکھ لیجئے۔ یہ تو میرا کبل ہے“ اس کے رونے اور وسیم دلہن کے چلانے کی آواز سے نسترے چونکی۔ پہلی نگاہ سے بچہ کو ڈھونڈھا اور نہ پایا بہت پریشان ہوئی اور لپکی۔ دیکھا تو ادھر یہ معاملہ گزر رہا تھا وسیم دلہن اس کا ہاتھ پکڑے کھڑی تھی اور چور بتا رہی تھی، بچہ ہر چند کہہ رہا تھا کہ ”میرا کبل دیکھ لیجئے“ مگر اسے یقین نہ آتا تھا، نسترے نے پوچھ کر کہا ”کیا ہوا جناب“

وسیم دلہن۔ ”ہوا کیا تو بلبلاتی کیوں دوڑی اور کفن بھاڑ کر آئی؟“

نسترے۔ ”میں دریافت کرتی ہوں کہ اس سے کیا خطا ہوئی؟“

وسیم دلہن۔ ”یہ تیرا کون ہے بھائی ہے بھتیجا ہے بھانجا ہے بیٹا ہے جو پوچھتی ہے؟“

نسترے۔ ”یہ میرا سب کچھ ہے مگر اس کی خطا تو معلوم ہو؟“

”کچھ۔“ بیگم صاحب میری آنکھیں دکھ رہی ہیں ان بیوی کے پاؤں پر میرا پاؤں پڑ گیا“

اتنا کہہ کر لڑکے نے کبل تھوڑا اور کہا ”دیکھ لیجئے میں نے تو کچھ نہیں چسپایا۔“

نسترے نے آگے بڑھ کر بچہ کا ہاتھ چھٹایا اور کہا ”لایئے میں آپ کی جوتی دھو دوں“

اور پاؤں صاف کر دوں واقعی اس سے غلطی ہوئی“ وسیم دلہن نے اس کا جواب کچھ

نہ دیا منہ ہی منہ میں بڑ بڑاتی چلی گئی۔ بچہ دروازہ میں پہنچ چکا تھا کہ پیچھے سے یہ آواز اس کے کان میں آئی۔ ”میاں تم نے کھانا کھا لیا“

اس کی آواز بھڑائی ہوئی تھی اس کی آنکھ سے آنسو نکل رہے تھے چوری کے الزام نے اس کے ہوش نازل کر دیے تھے وہ سنسنوں کا فقرہ اچھی طرح نہ سمجھ سکا اور پھر کبیل جھانک کر کہنے لگا۔ ”دیکھ لیجئے میں نے روٹی نہیں چرائی“ سنسنوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا ”میں یہ نہیں کہتی۔ پوچھتی ہوں تم نے کھانا کھا لیا“ کھانے کے سلسلہ میں آنے کی سزا بھگت چکا تھا۔ تھپڑا دو چوری نے اس کو سبق دے دیا تھا اور اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ کسی طرح چھپا چھڑا کر بھاگے بچہ آخر بچہ تھا نفی سے دل میں بہشت بیٹھ گئی تھی پھر یہ ہی کہتا ہوا آگے بڑھا۔ ”جی ہاں کھا لیا“

سنسنوں نے چمکا را اور کہا ”میاں میں دیکھ رہی تھی تم نے کھانا نہیں کھایا آؤ چلو کھاؤ“ چمکا رانا اور سر پر ہاتھ پھیر کر تشفی اور دلاسا دینا قیامت تھی کہ دکھتی ہوئی آنکھیں دریا بہانے لگیں اور زخمی دل پھوٹ پڑا کہنے لگا ”بیگم میرا ایک ہاتھ نہیں ہے آنکھیں دکھ رہی ہیں روشنی میں نہیں کھا سکتا“ سنسنوں ”چلو میرے ساتھ چلو میں انتظام کر دوں گی“ لڑکا۔ ”آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں مجھے جانے دیجئے اللہ مالک ہے پیٹ بھر دیگا“

سنسنوں۔ ”ہاں یہ درست ہے مگر جب کھانا موجود ہے تو کیوں نہ کھاؤ۔“

لڑکا اس وقت شدت سے رویا اور کہا۔ ”بیگم میرا ہاتھ نہیں ہے“

سنسنوں۔ ”میں تم کو اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گی“

لڑکا اس کا یقین نہ کر سکا اور کہنے لگا۔ ”نہیں آپ کیوں کھلانے لگیں مجھے جانے“

دیجئے میرے پاس یہ تھوڑے سے چنے بندھے ہیں کھا کر سو رہوں گا“

سنسنوں۔ ”تم ڈرو دست میں تمہاری ماہوں مجھے تم اپنی ماتھجو“

اب لڑکے نے ایک چنچ مار کر کہا ”نہیں بیگم میری ماں اللہ کے ہاں گئی اور میرے“

اٹا کو بھی بلا لیا۔

سنسن لڑکے سے زیادہ روئی اور چپکاری اور پیار کرتی اپنے خاص کمرہ میں لائی۔ روشنی کی طرف اس کی پشت کی اور اپنے ہاتھ سے نوار منہ میں دیا، عادت یہ تمام کارروائی اپنی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ اور خوب سمجھتا تھا کہ میں جس کے پلنگ پر کبھی اجلی چا دی بھی نصیب نہ ہوئی آج اس عالی شان مکان کا مالک ہوں جس کی دبیر تک قالین کا فرش ہے جتنی یہ ہے کہ نیک فرمانبردار اور پاسا بیوی اس طرح فقیر شوہر کو بادشاہ بنا دیتی ہے سنسن بچہ کو سر پر ہاتھ پھیر کر کھانا کھلا رہی تھی کہ دروازہ پر فل غبارہ کی آواز سنائی دی۔ کوئی دو لمحے بعد مانے آکر کہا ”سرکار تھانہ آتے ہیں۔ اسلامہ میاں کے ہاتھ میں ہتھکڑی پڑی ہوئی ہے“ عادت گھبرا کر باہر گیا تھانہ دار نے کہا ”میں بے قصور ہوں کمپتان صاحب نے خود مقدمہ کی تحقیقات کی ہے جننا والے فقیر کے ہاں جو دو قتل ہوئے ہیں مریدوں کا بیان ہے کہ یہ اس میں شریک تھا اور اُس نے خود ڈپٹی صاحب کے سامنے اقرار کر لیا!“

سوکن کی مصیبت نے حق یہ ہے کہ وسیم دہن کی زندگی کو جلا جلا اور سلگا سلگا کر خاک کر دیا تھا وہ بظاہر زندہ تھی کھاتی بھی پیتی بھی سنتی بھی تھی بولی بھی مگر دل کی کلی جو مہا چکی تھی اس کا کھلنا اب ناممکن تھا۔ یہ صحیح کہ اپنی طرف سے سنسن عورت میں تو قیر میں آداب میں مراتب میں خاطر میں مدرات میں کبھی نہ سرق نہ آنے دیتی اور نہ آنے دیا مگر اس کا یہ خلق و انکسار بد بخت کے زخم پر کچھ کے تھے گھلتے گھلتے بدن سوکھ کر ڈھانچ اور طباق سا چہرہ سیپی رہ گیا اکثر روئی اور اپنی غلطیوں پر نادم خود اپنے اوپر لعنت ملامت بھیجتی اب اس کو ابھی طرح یقین ہو گیا تھا کہ بیوی باپ کے پیٹ سے بیگم نہیں پیدا ہوتی۔ لونڈی بنکر بیگم بنتی ہے گھر بھر پٹا سوتا اور وہ اپنے جھگڑوں میں لپٹی اُبھرتی اور اب تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ

اجرم افکار اور متواتر صدقات نے اس کو قبر کا مردہ بنا دیا تھا وہ کہنے کو زندہ تھی مگر مُردے سے بدتر، کھڑی ہوتی تو چکر آتے بیٹھتی تو سر پھرتا۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ چلتے چلتے گھمیری آئی اور وہیں بیٹھ گئی۔ اسلام کی گرفتاری کی خبر کان میں پہنچتے ہی ایک سسنی آگئی، اٹھی دروازہ تک پہنچی جھانک کر دیکھا تو کلیجہ کا ٹکڑا سپاہیوں کے ہاتھ میں گرفتار کھڑا ہے ایک جھج مار کر گری اور یہ ہوش ہو گئی!

خدا دشمن کو بھی یہ وقت نہ دکھائے، کس باپ کا بیٹا اور کس دادا دادی کا پوتا۔ قسیم وہ قسم جس کے ادنیٰ اشارہ پر ایک دو نہیں بیسیوں اور سینکڑوں آدمی جیل خانہ میں اندر سے باہر اور باہر سے اندر پہنچ گئے۔ نسیم و نسیمہ جس نے دو چار کی نہیں سینکڑوں کی مصیبتیں چٹکی پکاتے ہیں حل کر دیں آج قسیم اور نسیمہ کا حقیقی پوتا اسلام محض ماکہی جہالت کی بدولت گرفتار اور ذلیل و خوار تھا۔ نشتون سو کن کو سپوش دیکھ جلدی سے پانی لائی بھینٹ دیئے عطر سنگھایا لٹائے رکھے و نسیم دہن کی آنکھ کھلی تو عورت نہیں ایک پتھر تھا جو بے حس و حرکت پڑا تھا۔ مصیبتوں کی پوری پورٹ آنکھ کے سامنے تھی اور بچہ کی قید اس کی بے بسی اور مجبوری کلیجہ پر برہمچیاں چلا رہی تھی دفعتاً کچھ خیال آیا اٹھ کھڑی ہوئی دروازہ میں پہنچی۔ جھانکا اور چلا کر کہا ”اے اسلام یہ بدن پر بدھیاں کیسی ہیں؟“

ماکی آواز سننے ہی اسلام کی پچکی بندھ گئی اور کہا ”سپاہیوں نے مارا ہے“ عارف کو مجرم سے کیا اس کی ماسے بھی کوئی ہمد دی نہ تھی اور سچ یہ ہے کہ دونوں اس کے مستحق بھی نہ تھے مگر نشتون کے اصرار اور عارف کی خواہش پر چونکہ تحصیلدار تھا نھانہ دار نے اسلام کو اندر جانے کی اجازت دے دی۔ لاکھ صحبت خراب اور بیوقوف ماکہ بچہ تھا۔ مگر اب سر پر آکر پڑی تو پھٹکے پھوٹ چکے تھے ایک ایک کا منہ حیرت سے تکتا تھا اور ملبلا ملبلا کر اس درد سے اپنی جگہ گناہی کا اظہار

اور سپاہیوں کی زیادتی کی داستان سنا تا تھا۔ کہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔ یہ سب کچھ تھا مگر رانی باپ کے بس کی تھی نہ ما کے اور بہن کے اختیاری کی تھی نہ بھائی کے۔ دس پنارمنٹ اسلام آباد ریٹائر اس کے بعد تھا نہ دار نے تقاضا کیا اور عادت لیکر چلا تو بد نصیب مجرم کے گلے میں صرف اکہری اچکن تھی رات سر پر تھی اور موسم سرد۔ نستانوں نے جلدی سے اپنا چادرہ اُتار کر اس کو اڑھا دیا وہیم وہن اس سے بات کرنے کے قابل نہ تھی اس کی آواز وہیم ہو چکی تھی۔ بچہ اس کی صورت دیکھتا رخصت ہوا اور وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی؛

گیارہ روز اور بارہ راتیں بد نصیب ما پر جب تک مقدمہ طے ہوا اس طرح کٹیں بیان کرنے کے قابل نہیں۔ اب وہ سوکن اور نستانوں سب کو بھول گئی تھی بچہ کی تصویر سیر لمحہ آنکھ کے سامنے تھی، جوش دیوانگی میں یہاں تک ہوا ہے کہ راتوں کو زمین کھول کوٹھے پر چڑھ گئی اور گلی میں دیکھا کہ شاید آ رہا ہو!

آخر وہ رات سر پہ آ گئی جس کی جینے کا اور بیٹے کی تفتیر کا فیصلہ کرنیوالی تھی۔ غروب آفتاب کے ساتھ ہی وہ ما جس نے نو جینے پیٹ میں رکھا دو سال کے قریب خون جگر پلایا اس خیال سے کہ بے گناہ بچہ کی اذیت کا سبب میں ہوں میری کی طرح تھر تھر کانپنے لگی۔ اس مصیبت اور تکلیف پر اس یقین نے کچھ ایسی نمک مرچیں چھڑکیں کہ مچھلی کی طرح چاروں طرف تر پٹنے لگی۔ وہی وسیم وہن جس کو بیگم بیگم کہتے عادت کا منہ خشک ہوتا تھا اور آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتی تھی اس وقت اس کے قدموں پر جا کر گری۔ اسی نستانوں کے آگے جس کے بچہ کو ایک معمولی گیند کیو اسٹے تین گھنٹے دروازہ پر کھڑا رکھا اور کٹ ٹی نہ کھولی ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوئی کل جس بن اس کے بچہ فاروق کی معصوم انگلیاں قصائی کی طرح پھری سے فرج کیں اور دھل دھل خون بہا کر بھی تیوری پر بل نہ آیا۔ آج اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا مگر اب ان

باتوں میں کیا رکھا تھا، خدا کی لالچی بے آواز تھی، دیر تھی اندھیر نہ تھا پاپ کی ناؤ بھر کر ڈوبی تھی عادت اور ناستون تو اس کو سمجھا رہے تھے مگر جس بے گناہ فادوق کے یہ الفاظ اب تک کانوں میں امانت تھے ”ابھی اب نہیں“ وہ بھی متلاتی ہوئی زمان میں کہہ رہا تھا ”روو نہیں“ رات کی ہر گھڑی سال سے زیادہ تھی کلیجہ پر گھونسنے مارتی بلبلائی اور دعائیں مانگتی کہ کل اسلامہ کو گلے سے لگا کر کلیجہ ٹھنڈا کر لی۔ دن کے ڈوبے ہوئے جب ماکے کانوں میں یہ آواز پہنچی کہ پندرہ سولہ برس کی کمائی لٹ گئی اور اسلامہ اس کی آنکھوں سے ہمیشہ کو اور اس کے سینہ سے سدا کو اوجھل ہوا۔ اور پھپھ گیا، عبور دریا سے شور کی سزا ہو گئی اور جمعرات کو روانگی ہے۔

پچھاڑیں کھاتی تھی، ٹکریں مارتی تھی، سر پھوڑتی تھی مگر نتیجہ کچھ نہ نکلتا تھا اسی ماکے دل سے پوچھنا چاہئے۔ جس گھر سے جوان شیر کا زندہ جنازہ نکل رہا تھا کہ کیا گزر رہی ہے؟

دن ہوا کی طرح گزرے اور وہ رات بھی آپہنچی جس نے ناستون کی غیر معمولی ضد اور عادت کی مجبورانہ کوشش سے ماکو پیچ کی آخری صورت دکھا دی۔ یہ قیامت خیز منظر رات کے دو بجے واقع ہوا وسیم دلہن ہٹکڑی اور بیڑی ولے اسلامہ کو کلیجہ سے لگائے گہرام مچا رہی تھی بالآخر ماکے نگاہ آخر کچھ کے چہرہ پر پڑی اور وسیم دلہن کا لال ہمیشہ کو جدا ہو گیا۔

عادت اور ناستون دونوں وسیم دلہن کو تشکین دے رہے تھے مگر مصیبت وہ مصیبت تھی جس کے بعد راحت کی امید نظر نہ آتی تھی، گھبرا کر باہر نکلتی تھی انگنائی میں ٹہل کر پھر اندر آ جاتی تھی یہ ہی کرتی اور کرتی پھر ہی تھی۔ چار بجے کا وقت ہو گا بزم فلک چاند اور تاروں سے کچھ کچھ بھری تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے زور شور

سے چل رہے تھے حالت اضطراب میں وسیم دلہن نے اوپر نگاہ اٹھائی ٹکٹکی باندھ
اپنی مصیبت میں مستغرق تھی کہ چاند کے پاس ایک ابر کا ہلکا ٹکڑا نمودار ہوا اس طرف
متوجہ تھی اور دل میں سوچ رہی تھی کہ کیا یہ سچ ہے کہ اسلام کو پال پوس کر چھاتی
پر لٹا کر کلیجہ پر سلا کر اسی لئے جو ان کیا تھا آج رات کو وہ ہمیشہ کو مجھ سے چھوٹ جائے
ہائے مجھ سے زیادہ بد نصیب دنیا میں کون ہو گا۔ پڑتی پڑ پڑی اور ایسی پڑی
کہ سر اٹھانے کی فرصت نہ ملی سننتی ہوں کہ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے
میں نے آج تک کسی کا کیا بگاڑا مگر ایک دن بھی تو چین کا دنیا میں نہ گزرا
شادی ہوئی تو میاں کالے کوسوں پر دیس سیدھا رے خدا خدا کر کے لوٹے تو
صورت تک دیکھنی نصیب نہ ہوئی قبر میں جا سوئے دوسرا گھر لیا یا تو اس میں
یہ پتھر پڑے اب اس صدمہ نے تو جان ہی پر بنادی، تارے اور چاند سب
چمک اور دمک رہے ہیں بادل پھٹ پھٹ کر چاند نکل رہا اور چھپ رہا ہے
اب کے تو اسلام کی صورت نظر آ جائے!

(۶)

قصر نسیم میں داخل ہوتے ہی پاک روح نے اُن لاتعداد روحوں کا مطالعہ
کیا جو اپنے اعمال کی سزا بھگت اور افعال کا انعام پا رہی تھیں۔ وہ ایک رونا
عورتوں کے طبقہ میں ادھر ادھر پھر رہی تھی۔ کامیاب روحوں کو دیکھ دیکھ کر اس
کا دل باغ باغ ہو رہا تھا۔ کہ ایک کونے سے رونے کی آواز اس کے کان میں
آئی تعجب یہ تھا یہ قطعہ چین بھی جنت الفردوس میں داخل تھا جہاں ہر روح
اطمینان کے ساتھ راحت ابدی کے لطف اٹھا رہی تھی، نسیم حیران ہو کر ادھر
پہنچی تو کیا دیکھتی ہے کہ محل و یا قوت کے بیش بہا زیوروں کے ساتھ ایک ظلمانی
زنجیر بھی اس عورت کے پاؤں میں پڑی ہوئی ہے جنت کی تمام نعمتیں اس کے

واسطے موجود ہیں مگر یہ اجازت نہیں کہ وہ اس قطعہ سے نکل کر دوسری جگہ جاسکے اس کی آزادی مشروط اور اس کی جنت محدود ہے۔ نسیم جتنی قریب پہنچتی تھی اتنی اس کی حیرانی بڑھتی جاتی۔ کامیابی کا ہر نشان اس کے پاس موجود تھا۔ فرائض کی غفلت کا تیل برابر دھبہ اس کے اعمال میں نہ تھا۔ رضامندی شوہر کا گرفتار تھا۔ رنج و ہراس کے ماتھے پر تھا۔ ساس سسر کی عظمت بابا پ کی خدمت کے درخشاں آئینے اس کے کانوں میں تھے، نازیں اس کی پوری تھیں روزے اس کے مکمل تھے۔ نسیم نے ہر چند غور کیا مگر راز سمجھ میں نہ آیا اشتیاق زیادہ ہوا تو خود اسی سے دریافت کیا کہ ماجرا کیا ہے :-

عورت کی روح مسکرائی اور کہا : کیا بتاؤں اور کیونکہ کہوں کہ کس غلطی میں گرفتار ہوں میں نے جس کو تیل سمجھا وہ من اور رائی جانا وہ پہاڑ نکلا۔ ایک ذرہ بھر غفلت نے جنت کو دوزخ بنا دیا اب کچھ ہے مگر اس جگہ سے قدم نہیں سرکا سکتی !!

معاملہ یہ ہے کہ میں نے کوار پتہ میں مہیکہ کو سرا اور والدین کو نعمت غیر مترقبہ سمجھا کہنے والے تو زبان سے کہتے ہیں مگر میں دل سے سمجھتی تھی کہ مامی دہلیز اور باپ کا گھر ایک روز چھوٹنے والا ہے۔ میں یہاں سدا مکنے اور ہمیشہ رہنے والی نہیں۔ یہاں سے روانہ ہونے کے بعد آنکھیں ان دونوں پیاروں کی صورت کو ترسیں گی اور یہ نظر نہ آئیں گے۔ یہ میری صورت کے عاشق اور نام کے دیوانے ہیں ان کا غصہ محبت ہے ان کی خفگی عنایت ہے ان کا طیش شفقت اور ان کی نفرت صداقت۔ ان کی آہ لگنے والی ان کی دعا قبول ہونے والی اور دراجابت تک پہنچنے والی اور ان کی فریاد عرش کا گنگورہ ہلانے والی ہے۔ یہ میری کمائی کا وقت ہے بچپن نہیں اور دور اندیشی کے دن ہیں کوار پتہ

نہیں میں اپنے یقین پر کاربند رہی اور اسی یقین کے موافق وہ وقت آیا کہ میں ان کی چوکھٹ سے وداع ہو کر پالکی میں سوار ہوئی۔ لڑکیاں عام طور پر اس وقت روتی ہیں میں بھی رونی مگر میرے رونے میں ہنسنا میری جبرانی میں اطمینان اور میرے رنج میں خوشی شامل تھی۔ جن کے مسراق کا رنج ہوتا ہے جن کی جدائی تکلیف دیتی ہے۔ جدا ہونے والی سے کوئی پوچھے کہ وہاں تیرا رونا سچا اور غم درست مگر یہ تو بتا کہ ان ماباپ کو خوش رکھ کر چلی یا جلا ستا کہ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے میں اس کسوٹی پر کندن کی طرح چمک رہی تھی۔

کواریتہ کا ایک لمحہ بھی ایسا نہ گزرا تھا کہ ماباپ بہن بھائی نوکر چاکر پڑوس ہمسایہ کسی کو بھی کبھی تکلیف دی ہو، رنج ضرور تھا مگر رنج سے زیادہ خوشی، صدمہ یقیناً تھا مگر اطمینان بھی صدمہ سے کم نہ تھا۔ سسرال پہنچی تو میاں کو میاں بنانے میں کچھ وقت نہ اٹھائی پڑی ساس کو کبھی ایسا موقعہ ہی نہ دیا کہ وہ آڑھی ٹیڑھی باتیں کریں۔ بیوی بنگر گئی اور بیٹی بن کر رہی میں بیٹی بڑے باپ کی ضرورت تھی مگر بیوی بھی کسی غریب فقیر کی نہ لکھتی والدہ کی میرا شوہر متوسط حیثیت کا آدمی تھا جو شروع ہی سے میرا قدر دان اور معقول انسان نکلا۔ اتنی بات ضرورت تھی کہ ہم دونوں کی محبت کو جو روز بروز ترقی و استحکام ہوا اس کی کوشش سے میں کبھی غافل نہ رہی مجھ کو بڑی بوڑھیوں نے بتا دیا عقل مندوں نے پڑھادیا اور دنیا کے تجربے نے سکھا دیا تھا کہ مرد کی محبت قابل اعتبار نہیں یہ طوطے کی طرح دیدے بدلنے والی ذات ہے بیوی تو کیا یہ بے وفا اسی کے نہیں جو کلیجہ کا ٹکڑا اور آنکھوں کی ٹھنڈک کہلائے آج بیوی پر فریفتہ اور بچوں کے عاشق زار ہیں کل دوسروں کی محبت میں گرفتار ہو کر معصوموں کی یہ مٹی خوار ہو رہی ہے کہ الہی توبہ! یہ ہی وجہ تھی کہ میں نے ان کی عنایتیں

دو دھکا ابا ل سمجھیں اور جب تک وہ کئی بچوں کے باپ نہ ہو گئے ہیں نے ترقی
محبت کی کوشش میں کمی نہ کی جس قدر ان کی محبت بڑھتی تھی اسی قدر میری خدمت
میرے خسر بیٹے کے محتاج نہ تھے وہ خود پچاس روپیہ کے وظیفہ خوار تھے یہ
ان کی مصالحت تھی اور نہایت دور اندیشی کہ میرے شوہر کے ملازم ہوتے ہی
انہوں نے ہم دونوں میاں بیوی کو ایک چھوٹا سا مکان دیوار نیچے لے آگے
کر دیا بیوی اس علیحدہ گی کی منتظر رہتی اور خدا سے چاہتی ہیں کہ علیہ ہو کر
وہ خود محتاج نہ رہیں مگر میں اس عالم ارواح میں مالک زمین و آسمان کو شاہد کر کے
کہتی ہوں کہ جھگڑے مطلق خوشی نہ ہوئی میری ساس وہ ساس نہیں کہ میں ان پر
سے قربان مگر چونکہ حکم تھا اس لئے طوعاً و کرہاً تعمیل کرنی پڑی اور میں بیوی
سے گھر والی ہو گئی :

میرے شوہر ابتدا میں سبیس روپیہ کے نوکر تھے سال بھر بعد چھپیں اور پھر
تیس اور آخر کار تیس سے چالیس پانے لگے اس وقت ہمارے ابا جان نے دنیا
کو چھوڑ کر یہ جگہ آباد کی، انا جان بیوہ ہوئیں تو ان کے ساتھ ایک کواری لڑکی
محمودہ گیارہ برس کی تھی، ہم دونوں میاں بیوی کا یقین تھا کہ اگلے زمانے کے
آدمی ٹکے گز کی چال کچھ نہ کچھ کھرچن ضرور موجود ہوگی مگر یہ بھرم ہی بھرم
تھا ان کے پاس سوا خولی کڑوں کے جن کو ہم ٹھوس سمجھتے تھے اور کچھ نہ تھا۔
اور چار روپیہ مہینہ جو ہم ان کو دیتے تھے۔ اسی میں دونوں ماہیٹیاں گزر کر تھیں
نہیں یکپیرا لٹہ کھانا پینا سب اسی میں تھا چار روپیہ ہستی ہی کیا رکھتے ہیں۔ ڈھائی
تین مہینے بھی ہی انا جان نے بیٹے کو وہ کڑے بیچنے کو دیتے ہم جس کو
تین چار سو کا مال سمجھتے تھے وہ چالیس کا لکلا یہ معمولی رقم کب تک ساتھ
دیتی چھ سات مہینے میں ختم ہوئی اور اب ان دونوں ماہیٹوں کا سہارا صرف

ہمارے چار روپیہ تھے۔ گو آج مجھے دنیا سے کوئی تعلق نہیں مگر اتنا ضرور کہو گئی کہ زمانہ جو لڑکیاں بڑھیاں بنا کر خاک میں ملا چکا وہ طبقہ نسوان کے واسطے قابلِ فخر تھیں اور وقت جن کو جوان کرتا ہوا ترقی کے میدان میں پہونچا رہا ہے یہ کچھ عورتوں ہی کے واسطے نہیں عورتوں اور مردوں دونوں کے بلکہ مذہب تک کے واسطے لائقِ افسوس ہیں۔ ما جس نے گوشت کے ٹوٹھڑے کو خون جگر پلا کر ہٹا کٹا موٹا نازہ اور اس لائقِ کیا کہ چالیس روپیہ ما ہوا کرکے لگے ایمان کی بات یہ ہے کہ جس قدر حق جتنی کم تھو دنیا جس وقت بیٹھی نیند کے مزے لیتی تھی خلقت جس وقت نرم اور گرم بچھونوں میں پڑی سوئی تھی باپ جس وقت بے خبر پڑا خڑٹے لیتا ہوتا تھا۔ اُس وقت ما اپنی سیپنڈاڈا کر سکھ گنوا کر اُٹھ بیٹھتی تھی اور اس خیال سے ہناچہ بدل دیتی تھی کہ گیلانکلیف نہ پہونچائے جب وقت نے اس کا پاسہ پلٹ اور سہاگ کا زہیں لباس اُتار کر بیوگی کا برقعہ اُڑھایا تو وقت تھا کہ جو ہاتھ گھڑیوں پھینکنے سے نہ ٹھکتے تھے ان میں ریشم پڑا جو پاؤں گھنٹوں پٹلتے ٹھلتے لوری دیتے تھے ان میں سکت نہ رہا اور جو آنکھیں چاندنی رات میں بیٹھ کر کلیجے کے ٹکڑے کے واسطے کرہ تیار کرتی تھی ان میں پانی اُتر آیا۔ ضرورت تھی کہ وہ ننھے ننھے ہاتھ جو ان ہاتھوں کو تھکا کر طاقتور ہوتے وہ ننھا متا سر جو اس سر کو چکر کر صحیح الدماغ بنا اپنے کندھے عاجزی سے جھکا دیتا۔ مگر ہمارے کانوں میں تیل تھا ہماری آنکھوں پر پردے تھے ہم سے زیا دہ محنت ہم سے زیادہ اندھا ہم سے زیادہ پہرہ کون ہو گا کہ ہم نے اُن کے حقوق نہ پہچانے اور اندھی آنکھیں جب دوسری آنکھوں کو اندھا کر کے روشن ہوئیں تو ان سے محبت کی نظروں کی بجائے نفرت کی نگاہیں نکلنے لگیں۔

میں نے جن سنوائی ہستیوں کو قابلِ ناز کہا ان میں میری اما جان بھی تھیں ہم نے

ان کے چار سے پانچ دن کئے مگر انھوں نے انتخاب کا ہاتھ ہمارے آگے نہ پھیلایا مجھے یہاں آکر معلوم ہوا کہ انھوں نے اس کواری بچی کو لئے ساری ساری رات فاقہ سے گزاری مگر کسی دوسرے پر اپنی تکلیف ظاہر نہ کی۔ یہ صحیح کہ اس کی ذمہ دار ہوں میں بھی مگر بڑا بار اُن کے صاحبزادے کی گردن پر ہے ماباپ کا اثر اولاد پر کس طرح پڑتا ہے اس کا ثبوت محمودہ کی زندگی بقی میں نے بار بار اس سے کہا کہ آمیرے ساتھ کھانا کھالے مگر اس نے ایک دفعہ بھی منظور نہ کیا اور ہمیشہ یہی جواب دیا کہ پیٹ بھرا ہوا ہے۔

رمضان المبارک کے چھینے میں میں نے یہ تجویز کی کہ سب لڑکیا اپنی اپنی افطاریاں لاکر ایک جگہ یعنی میرے ہاں روزہ کھولا کریں۔ محمودہ بھی اس میں شریک تھی۔ گرمی چونکہ قیامت کی تھی اس لئے ہم سب انگنائی میں روزہ کھولتے تھے۔ محمودہ اپنا شربت کا گلاس برفٹ فالودہ پڑا ہوا طشتری سے ڈھانک کر لاتی اور سب کے ساتھ روزہ کھولتی ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اس نے کبھی طشتری میں ہاتھ نہ ڈالا اور نہ اپنا گلاس کسی کو دیا۔ وہ بظاہر ہمارے مذاق اور مہنسی ٹھٹھول میں شریک ہوتی مگر اس کا دل چونکہ کچھ مردہ سا تھا اس لئے میں اس کی طرف زیادہ توجہ نہ کرتی۔ وہ دن گزر گئے اور میں وہ باتیں بھول بسر گئی۔ جب میں یہاں پہنچی ہوں تو معلوم ہوا کہ جس کے بھائی کی کمائی میں دودھ شربت کیوڑہ اور فالودہ سے روزہ کھولتی تھی اس بد نصیب کے گلاس میں محض سادہ پانی ہوتا! اس کو پھر رمضان سحری نصیب ہوئی نہ افطاری۔ نماز مغرب کے بعد چٹنی سے دو روٹیاں کھا کر روزے کی نیت کر لیتی تھی اور سو جاتی تھی۔

مجھے اب یاد آتا ہے کہ چار چار پانچ پانچ سیر برفٹ روزانہ آتی پھک پھک کر

گئی اور گھل گھل کر گئی مگر اس کو دینا نصیب نہ ہوا۔ اس لاپرواہی کے جرم میں اس خود غرضی کی سزا میں آج یہ عذاب بھگت رہی ہوں مگر مجھے اقرار ہے کہ میرا قصور سچا اور غلطی درست اس بچی کی طبیعت ہزار آفرین اور مرحبا کی مستحق ہے جس نے اپنی بیوہ ما کا بھرم نہ کھلنے دیا اور میری سفر و ر طبیعت لاکھ لعنت و ملامت کی مستوجب کہ بھول کر بھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ یہ سزا ایک ہزار سال کے واسطے تجویز ہوئی ہے۔ مگر مجھے تو ہر لمحہ ہزار سال ہے۔

سینہ یہ داستان سنکر لوٹنا چاہتی تھی کہ دوزخ کے طبقہ نسوان سے ایک عورت کے ہنسنے کی آواز آئی، داخلہ فرمیں کے بعد یہ آج پہلا اتفاق تھا کہ ادھر سے سینہ نے آواز سنی۔ دوزخ کا طبقہ طرح طرح کے عذاب قسم قسم کی تکلیفیں اسوچنے لگی کہ یہ ایسی کونسی بے غیرت روح ہے جو اس عذاب میں بھی ہنس رہی ہے آگے بڑھی اور دوزخ کے قریب پہنچی! بے شمار روہیں عذاب میں گرفتار اور اعمال پر شرمسار تھیں اور ہر ایک کی یہ خواہش تھی کہ صرف ایک دفعہ محض آزمائش کے طور پر ہم پھر دنیا میں بھی بیٹے جائیں تو ایسی نیک زندگی بسر کریں کہ فرشتے ہمارے دامن پر نماز پڑھیں۔ ان کی گریہ و زاری بے سود اور بے کار تھی۔ عذاب کے فرشتے طرح طرح کی اذیتیں پہنچا رہے تھے سینہ دوزخیوں کی کیفیت دیکھ کر قہر قہر کا پنے لگی۔ اور ادھر چلی جہاں سے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی سلام کیا اور پوچھا: ”بی بی اس تکلیف میں ہنسنے کا کیا موقع ہے؟“ اب اس روح نے ایک تہققہ لگایا اور کہا۔

”ہنسنا ہی نہیں میں خود دنیا سے ناپائدار کی ایک تعجب انگیز ہستی ہوں۔ میں ایک ایسی ما کے پیٹ سے پیدا ہوئی جو قدامت میں جکڑی ہوئی تھی برخلات اس کے میرا باپ جدت کا دل دادہ اور وقت کا ساتھی تھا مگر چونکہ دونوں کو

اختلاف مزاج میں ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ اور عمریں ختم کے قریب پہنچ چکی تھیں اس لئے کوئی خاص لڑائی جھگڑا نہ ہوتا تھا مگر وہ محبت جو میاں بیوی میں ہونی چاہئے دونوں اس سے محسوس نہ تھے۔ زندگی نام ہے وقت کو لطف اور اطمینان سے بسر کر دینے کا۔ شوہر بیوی کی آسائش کا ممتنی اور بیوی خاوند کی راحت و آرام کی کوشاں۔ یہ دونوں ہمارے گھر میں نہ تھیں مجھے اپنے بچپن کے تلاء کا ہوش نہیں نہ اس وقت کا حال معلوم ہے جب میرا وجود ہی نہ تھا کہ میاں بیوی کے اختلاف مزاج نے کیا کیا گل کھلائے مگر میں نے جو دیکھا اور جو سمجھا سکی وہ یہ تھا کہ آبا جان دن تو دن رات کا بھی بڑا حصہ مردانہ میں اخبار بینی یا درق گردانی میں گزار دیتے اور آبا جان رات تو رات دن کو بھی اوراد و وظائف ہی میں مصروف رہتیں مجھ پر اس وقت تو آبا جان ہنستی تھیں مگر یہاں اگر ان کو بھی معلوم ہو گیا کہ عورت جب تک دنیوی فرائض نہ ادا کرے محض دینی خدمات اس کے واسطے سفید نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان دونوں میاں بیوی کی تکالیف و ناموافقت کا تمام بار اُن کے والدین پر ہے کہ قبل از نکاح فریقین کے مذاق پر نظر نہ ڈالی مگر آبا جان بھی اس الزام سے بری نہیں ہیں کہ انھوں نے بعد از نکاح رفع اختلاف کی کوشش نہ کی۔ یہ درست کہ تغیر فطرت آسان نہیں۔ مگر مسلمانوں کے موجودہ تمدن کو ملحوظ رکھ کر یہ لازمی اور ضروری ہے کہ لڑکی کو اچھی طرح سمجھا اور پوری طرح بتا دینا چاہئے کہ اُس کی آزادی اس کی خواہش اس کا اطمینان صرف مافی دہلیز تک ہے سو دماغ ہوتے ہی اس کی ہر قوت دنیا نے سلب کر لی اور وہ پیدا ہی اس لئے کی گئی ہے کہ جو شخص شوہر کی حیثیت میں اس کے سامنے آتا ہے اس کا دل سحر کرے میں نے شاید یہ تو ابھی کہا ہے کہ فطرت کا تبدیل کرنا بہت مشکل

لیکن تم نے اور میں نے دونوں نے دنیا میں دیکھ لیا کہ بیل ہزار روستان جوشاخ گل پر بیٹھ کر ایک عالم کو تڑپا دیتی ہے پھر سے میں قید ہو کر بھی اپنی خوش الحانی کا فرض ادا کر سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں فطرت اور فرائض دونوں کو لازم و ملزوم کیوں نہ سمجھو۔ مرد نوکری کرتا ہے آقا کے حکم کی تعمیل اس کا فرض ہے لیکن اگر وہ فطرتاً رات کے بارہ بجے ایک قتل کی تحقیقات کو جانا ظلم سمجھتا ہے تو اس سے کہا کس کبخت نے تمہاکے تو تمہانہ داری کی کوشش کر یہ اختلاف مزاج اور ناموافقیت کے جھگڑے صرف جھوٹی ترقی کے نتائج ہیں، یہ ہی میاں تھے یہ ہی بیویاں تھیں اطمینان اور مزے سے رہتے تھے ہے نہ کچے کچے۔ اب مسلمانوں نے دوسروں کی دیکھا دیکھی حقوق نسواں کے نعرے بلند کرنے شروع کئے۔ مگر عقلمندوں کو پہلے یہ سوچ لینا چاہئے کہ اسلام نے جو ان کو حقوق عطا کئے ہیں ان کا عشر عشر بھی دوسری جگہ موجود نہیں اس وقت ایک عورت شوہر کے بازو پر سہارا دیئے فکر کرتی پھر کتنی چٹکتی مشکتی جاتی ہوئی بہت اچھی معلوم ہوتی ہے وہ شوہر بھی ہے یا نہیں یہ تو خدا جانتے مگر پر دے میں بیٹھنے والیوں کو اس کی آزادانہ اور پر لطف زندگی پر ضرور رشک آئے گا۔ مگر عقلمندی یہ بھی سوچ لیں کہ ان پٹاپٹی کے پردوں رنگ آمیزی چلمنوں اور گنگا جمنی کو اڑوں کے بعد اندر کا فرش محل نہیں دلدل ہے! پہلی سزا تو آزادی نے اس کو یہ دی کہ دنیا میں کوئی چیز اس کی ملکیت ہی نہیں جو ہے وہ شوہر کی۔ دوسرا سلوک یہ ہے کہ شوہر کے ہاتھوں کیسی ہی مصیبت کتنی ہی اذیت کیوں نہ پہنچ جائے دوسرے کی مجال نہیں کہ دخل دے، ما بھی موجود ہے باپ بھی بہن بھی اور بھائی بھی مگر انتخاب نکاح میں کسی کا مشورہ تمہانہ صلاح جو کیا وہ بھگتو جو پڑی وہ اٹھاؤ، خیر میں اس پر زیادہ بحث کی ضرورت

ہنیں سمجھتی۔ آدم پر سیر مطلب دن ہمارے سامنے راتوں سے راتیں دنوں سے بدلتی تھیں مگر مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی بھی دونوں میاں بیوی کو خلوص و غمت سے باتیں کرتے دیکھا ہو۔ شکایت جو سبب ہے محبت کا کبھی کسی کی زبان پر آئی ہی نہیں جس طرح جیل خانہ کے قیدی اپنا وقت پورا اور دن ختم کرتے ہیں اسی طرح معلوم ہوتا تھا کہ یہ دونوں بہ جبر و اسکرہ زندگی کی شکر میں جتنے ہوئے قدم اٹھا رہے ہیں، میرا کواری پتہ ضرور تھا۔ مگر بچہ نہ تھی۔ سمجھتی تھی جو ہوتا تھا اور جانتی تھی جو دیکھتی تھی۔ متعجب تھی اور متحیر کہ آخر ان دونوں جسموں میں دل ہیں یا پتھر کہ کبھی کوئی خواہش یا اُمنگ پیدا ہی نہیں ہوئی۔ آبا جان ہیں وہ دن بھر باہر رہے رات کو مسافر کی طرح سمجھ کر گھر میں آئے اور پڑ رہے آتا جان ہیں وہ دن بھر گھر کے کام دھندوں میں لیٹی رہیں رات کو جانماز پر بیٹھیں تو دو بجا دیئے۔ میں نے آبا جان کو کبھی خندہ پیشانی آبا جان سے مجھے یاد نہیں کہ بات کرتے دیکھا ہو۔ کچھ ایسی خاموش اور گم سم طبیعت لیگر آئی تھیں کہ کسی فرحت یا دلچسپی سے واسطہ ہی نہ تھا، گانے میں وہ شریک نہ ہوتیں، ہوا، خوری کو وہ نہ نکلتیں، سیر کو ان کا جی نہ چاہتا، جلسہ کی انھیں خواہش نہ ہوتی ہاں مجبوری سے یا ضرورت سے جب میں جوان ہو چکی ہوں اُس وقت البتہ کوئی دن یا کوئی رات ایسی نہ گزری کہ انھوں نے میری شادی کی فکر میں انہیں شریک نہ کیا ہوا۔ یہاں تک ہوا ہے کہ آبا جان نے ایک موقع پر بگڑ کر کہہ بھی دیا ”کہ کیا تم کو میرا یہاں آکر پڑا رہنا بھی زہر لگتا ہے، کہ روزیہ جگڑا پھیر دیتی ہو، مگر ان کے کان پر جوں نہ چلی، خرابی آکر یہ پڑ گئی تھی کہ دونوں کے خیالات مختلف، طبیعتیں مختلف، تجویزیں مختلف، رائیں مختلف، جس رے کے کو آبا جان اچھا سمجھیں وہ آبا جان کی رائے میں کافر اور جس کو آبا جان

پسند کریں وہ آبا جان کے خیال میں اُلو، باتیں کئی موجود تھیں اور سنے پےینام بھی آئے رہتے تھے، مگر آبا جان کا کام صرف اتنا تھا کہ حرفت بھرت آبا جان کے سامنے پیش کر دیتی تھیں، اور وہ بھی کچھ اس قدر نخوت اور تکبر سے کہ آبا جان تو آبا جان مجھ تک کو سخت ناگوار ہوتا تھا، ایسا ٹھکڑا توڑ جواب دیتیں کہ بیچارے منہ نکتے رہ جاتے ایک بات کہہ دی اور چپ ہو گئیں اب سوال کرتے کرتے مر جائیں مگر ان کو جواب دینا قسم، آبا جان کی یہ بد مزاجی کب نہ بھر میں مشہور ہو چکی تھی، اور مرد و عورت ہر شخص نام رکھتا تھا مگر انھوں نے پروا نہ کی، ہم خوش نصیب تھے کہ ہمارے سر پر دادا جان کا سایہ ایسا بک موجود تھا، مگر بھوکی بد مزاجی سے اُن کا بھی دم ناک میں تھا، اور وہ کھلم کھلا کہتے تھے ”دوزخ کا پہلا طبقہ ان سنگ دل والدین سے لبریز ہوگا، جو اولاد کے نکاح میں عادات و اطوار کا لحاظ نہیں کرنے اور یہ انتخاب مخالفت مزاج کی وجہ سے زندگی صواب کرویتا ہے“ میں جب تو نہیں کہتی تھی مگر اب کہتی ہوں کہ جن لڑکیوں کی تربیت دامنِ قدامت میں ہوئی وہ پھر بسا غنیمت ہیں میں اس وقت تو جہالت کہتی تھی اور آج اس کو نعمت سمجھتی ہوں، دادا جان اپنی زندگی ہی میں لڑکی کے ہاں چلے گئے تھے، اور گو ہماری پھوپھی انا اپنی ذات سے بہت ہی معقول انسان تھیں، مگر تقدیر سے اُن کو ایسے طرار شوہر ملے تھے کہ سارا شہر ان کے نام سے کانپتا تھا، فرضی دستاویزیں، جھوٹے مقدمے اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا، دادا جان کا انتقال ہوتے ہی انھوں نے تمام جائیداد پر قبضہ کر لیا، اور کہہ دیا کہ مرحوم اپنی زندگی ہی میں بیٹی کو دے گئے ہیں، افسوس اس بات کا ہے کہ بیوی جان بھی ان کی عیاری میں برابر کی شریک تھیں، انھوں نے اپنی طرف سے غصب کی کوشش نہ کی ہو۔ مگر شوہر کی کوشش میں مزاحمت نہ

کرنا اس کی تائید اور شرکت سے کم نہیں یہ درست کہ وہ بیوقوف تھیں، اطاعت ان کا کام مگر اطاعت کے یہ معنی نہ تھے کہ جاوے جا کا امتیاز ہی نہ رہتا اور ایک حق کی ادائیگی میں وہ دوسرے حقوق کو پامال کر دیتیں، تنہی نہیں، بچی نہیں، نواسے نواسیاں موجود، پوتے پوتیاں موجود، میاں کو مائل کرنے کے بھی دن نہیں، خدا کو منہ دکھانے کا وقت تھا، ہماری بسر اوقات کا دار مدار اسی جا نداد پر تھا، جب یہ نہ رہی، تو تکالیف ظاہر تھیں، کھانے کے بھی لالے ہو گئے، اب ہمارے پاس صرف ایک مکان رہ گیا تھا، جس میں ہم رہتے تھے عدالت کے ذریعہ سے یہ بھی ہم سے چھینا گیا۔ صبح کی نماز سے فراغت پا کر آما جان جانا زپر بیٹھی تھیں کہ پھوپھی جان ہنستی ہوئی اُتریں اس وقت آبا جان کے پاس ایک پیسہ بھی نہ تھا وہ چھوٹے تھے، اور پھوپھی جان بڑی آگے بڑھے، شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے، کہ پھوپھی اماں بولیں :-

”آج اللہ رکھے افروز کی سالگرہ ہے جہاں زیادہ ہیں، تم جلدی سے مکان خالی کرو، آبا جان اتنا سنتے ہی سٹ پٹا گئے خاموش باہر نکلے، تو عدالت کے اہلکار موجود تھے، انھوں نے بھی تقاضا کیا، اندر آئے، آما جان کی طرف دیکھا اور کہا، ”ناصر اور چپر اسی مکان خالی کروانے آئے ہیں، چلو نکلو“ آما جان نے اور میں نے مل جل کر اسباب سمیٹا، جس روز سے دادا جان کا انتقال ہوا تھا، اور پھوپھا جان نے یہ ترکیبیں شروع کی تھیں اسی روز سے آبا جان اس صدمہ میں گھل رہے تھے، یہ دنیا نہیں عالم ارواح ہے، اور میں کیوں نہ کہوں ہم تینوں رات سے بھوکے تھے، آبا جان کی حالت تو پہلے بھی یہ تھی کہ دن رات اپنی نیسیبی اور بہن کے مظالم پر روتے، اُن کو بہن کی محبت بھی اتنی تھی، کہ آما جان کا دو ہزار روپیہ کا زیور سنکر کہ بہت تکلیف میں ہے فرض کے طور پر اُن کو دے دیا تھا،

جو پھر واپس آنا نصیب نہ ہوا۔

مکان کے چپے چپے اور کونے کونے نے آبا جان کے قدموں سے آنکھیں ملی تھیں وہ اسی گھر میں پیدا ہوئے جوان ہوئے اور بڑھا پا آیا، اُس وقت اس حالت میں کہ سانس کے سوا کچھ نہ تھا، اور ڈھانچ باقی تھا، حقیقی بہن کے ہاتھوں یہ صدمہ ایسا بیٹھا کہ ہوش جاتے رہے، جب ہم اس گھر سے نکلنے لگے، تو آبا جان لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگوں سے بہن کے پاس پہنچے اور کہا: ”اچھا آبا جان گھر مبارک ہو میں جاتا ہوں، مگر کیوں آپا کیا ہمارے باپ کی اولاد نہ تھا۔“

آگے آگے آبا جان تھے، ان کے پیچھے میں، اور آبا جان، اس وقت آبا جان کی آنکھ سے زارِ نظار آنسو بہ رہے تھے، اور وہ حسرت بھری نظروں سے مکان اور مکان کی دیواروں کو نہیں اس عورت کے چہرے کو دیکھ رہے تھے، جو ان کے دودھ کی شربک تھی، جس نے اُن کی ماں کے پیٹ میں پاؤں پھیلانے اور جس کے کان میں ما کے آخری الفاظ جس کے بعد اُن کی زبان ہمیشہ کو بند ہو گئی، وصیت یا امانت یہ موجود تھے کہ ”بیٹی چھوٹے بھائی کو بچوں کے برابر سمجھنا اور اس کو پیٹھ نہ دکھانا!“

آبا جان کی وہ نگاہیں جو اس وقت بہن سے رحم و کرم کی بلتی اور شفقت کی خواستگار تھیں، ناکام واپس ہوئیں، اور جب انھوں دیکھا کہ سنگدل بہن ما اور باپ دونوں کی شفقت فراموش کر چکی، اور آگے بڑھ کر شوہر سے کہنے لگی کہ ”اُس مکان میں سفیدی کی ضرورت ہے،“ تو انھوں نے پھر بہن کی طرف رخ کیا، ”ان کا دل بھرتا،“ اور آنسو کے قطرے متواتر لڑیاں بن چکے تھے، وہ محبت کے ہاتھ بہن کی گردن میں ڈال ان کے سینہ سے چمٹ گئے، گو اس منظر کے دیکھنے

والے آج قبروں میں پہنچ گئے ہوں مگر چمکتا ہوا آفتاب اور ہوا کے جھونکے جھنوں نے اپنی تیز نگاہوں سے مظلوم بھائی کو سنگدل بہن سے لپٹتے ہوئے دیکھا ابھی دنیا میں موجود ہیں! انسانی کان فنا ہو چکے ہوں، مگر زمین شہد ہے کہ آسمان اس وقت لرز رہا تھا، جب ہوائے بد نصیب بھائی کے یہ الفاظ گود میں لگے۔

”میتا جانی! اس مکان میں میرا اور تیرا دونوں کا نال گڑا ہوا ہے اب! اور اتنی پاک روہیں اسی سر زمین سے عالم بالا کو سدھاریں۔ یہ ان مٹنے والوں کی یادگار ہے جن کی صورتیں اب نظر نہ آئیں گی، آپا دونوں مختصراً اٹھیں گے، اگر مجھ کو نکال کر اس میں کرایہ دار آباد کیا“

پھوپھی جان کیا جواب دیتیں یہ کہنا مشکل ہے، ان کی زبان خاموش مٹی گویا کہ دودھ کا اثر اُن کے چہرے پر نام و نشان تک نہ تھا، مگر ان کا دل سیجا ان کی آنکھیں ڈبڈباتیں وہ ساکت تھیں، کہ پھوپھی جان نے ابّا جان کے وہ ہاتھ جو آج ۲۵ سال بعد ماسکے بدلے بڑی بہن کو ماسجھ کر ان کے گلے میں تھے جھٹک دیئے، سر پر دادا جان کی تصویر تھی، ابّا جان کی مایوس نظر ادھر پہنچی اور حالت اضطراب میں زبان سے یہ الفاظ ادا کئے:

”میں یہاں سے رخصت ہوتا ہوں فی امان اللہ“

جائداد اس طرح گئی، زیور اس طرح، جب آمدنی کے ذرائع نہ رہے تو روپیہ آتا کہاں سے، مختصر سا مکان کرایہ کا لیکر ہم تینوں جا بے یہاں متواتر نکلیوں اور وقتوں نے ابّا جان کی اور بھی رہی سہی کمر توڑ دی، اور اب ان کی یہ کیفیت تھی کہ گوشت کا ایک بے جان لونٹھرا پڑا ہوا ہے۔ جس حلق سے قورے کا لعاب بھی مشکل سے اترتا تھا، اب اس کو ڈھیر ڈھیر شوربا بھی غنیمت تھا، جو

آنکھیں اچھے خاصے پلاؤ کو بچ چکا کہ دسترخوان سے اٹھا دیتی تھیں، اب اُن کو معمولی خشک بھی امرت تھا، وقت نے اب ہم کو زندگی کی اس منزل پر پہنچا دیا کہ روٹیوں کے بھی لالے پڑ گئے، جب وہ وقت آیا کہ ایک روز دونوں وقت صبح اور شام ہم پر صاف گذر گئے، اور پہاڑ سادن محض پانی کے قطروں پر ختم ہو گیا تو غریب آفتاب کے ساتھ میرے باپ کا وہ بدنصیب مجسمہ جو حقیقی مین کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو چکا تھا، اور جس سے اب طاقت و توانائی رخصت ہو چکی تھی روتا ہوا اُٹھا، اور لکڑی ٹیکتا ہوا باہر نکل گیا۔“

(۷)

حق یہ ہے کہ عارف کے دوسرے نکاح نے وسیم دہسن کی انگلیں اور خواہشیں کبھی کی ختم کر دی تھیں، اس کے پہلو میں دل ضرور تھا، مگر وہ دل جس میں حسرت و نامردی کے سوا کسی دوسری چیز کا گزر نہیں اسلامہ کی جدائی نے اب اس نامردی میں ایک ایسی آگ سلگا دی جس کا دھواں رہ رہ کر اُٹھتا، اور شعلے تم تم کھم کھم کر پھڑکتے چار بجے کے قریب جب چاند کا روشن چہرہ اور نرم انجم بھبکی پڑنے کو تھی، وہ ٹکنکی باندھے ادھر دیکھ رہی تھی اس کو اس وقت ہوش سطلق نہ تھا، وہ دیکھ رہی تھی کہ چاند ابر میں پھٹ پھٹ کر نکل رہا ہے، عالم خیال میں دماغ نے یقین دلا دیا کہ عنقریب چاند کے بدلے اسلامہ کی پیاری صورت بادل میں سے نکلے گی، دل جو اُس کی جدائی کو ابدی سمجھ چکا تھا اس یقین کے ساتھ اچھل پڑا۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور کہنے لگی :-

”آآ اسلامہ میری گود میں چوٹ نہ لگ جائے۔“

یقین و استغراق کی حالت پہنچی کہ آنکھ ہٹنے کا، اور پلک جھپکنے کا نام

نہ لبتی تھی، دو پھیلے ہوئے ہاتھ مانتا کے جوش میں غیر معلوم جنبش کر رہے تھے کہ دفعتاً ابرغلیظ کے ٹکڑے نے چاند کو آغوش میں لیا، ہوا میں صبح کی خشکی پیدا ہو چکی تھی اور تارے ایک ایک دو دو کر کے رخصت ہونے شروع ہو گئے تھے وسیم دلہن انگنائی میں ودارع شب کا منظر دیکھ رہی تھی، کہ بادل پھٹا جس کے ساتھ ہی بد نصیب مامی تو فعات میں کامیابی کا اضطراب اور ترقی کر گیا۔ نگاہ جمی ہوئی تھی، کہ دفعۃً آسمان سے ایک انسانی صورت نیچے اترتی دکھائی دی، اُپھلنے کی کوشش کرتی تھی، لیٹنے کی تجویز کرتی تھی، برہنہ کا خیال کرتی تھی، کہ وہ صورت قریب پہنچ گئی جس کو دیکھتے ہی ماما کا اضطراب خواب سے، توقع دہشت سے اور محبت ڈر سے بدل گئی۔ پھر تھرکا پنے لگی عرش پر گیا لپکی بن گئی، دیکھتی کیا ہے کہ نیہر جس کو دنیا سے اُٹے مدتیں ہو چکی تھیں دانتوں میں انگلی دینے اس طرح سامنے کھڑی ہے کہ آنکھ سے آنسو کی لڑیاں بہہ رہی ہیں، چاہا کہ جھک کر سلام کرے مگر رعب اس قدر چھایا ہوا، حالت اس درجہ بگڑی ہوئی تھی اور حواس اس حد تک غائب تھے کہ کوئی عضو اختیار میں نہ تھا، ارادہ کرتی تھی کہ چیخوں مگر خوت یہاں تک ترقی کر گیا تھا، کہ آواز بھی نہ نکل سکتی تھی، رات چاندنی تھی، مگر کچھ ابر کا اثر کچھ ماہتاب کا وقت رخصت، چادر ہتھاب ملگجی سی تھی، لیکن اس لڑائی صورت کے نزول سے انگنائی اور دالان، کمرہ اور سائبان، درودیوار تک منور تھے۔ شب قدر کا سا عالم تھا کہ ہر سمت ہتھاب چھٹ رہی تھی، وسیم دلہن متحیر و ششدر کھڑی تھی، کہ نسیمہ آگے بڑھی اور کہا:

”بیٹی! آنکھیں آسمان سے زمین تک چھڑکاؤ کرتی اور بد نصیب نسیمہ خدا کے پاک گھر سے تیری ناپاک دہلیز تک روتی بیٹی آئی ہے! بیوندین ہو جاتی

تجھ جیسی ناشاد و نامراد ما اس سے پہلے کہ تیرے ہاتھوں عالم بالا کی مطلق برحقیت
تیرے بچہ کی بربادی کا مرتبہ پڑھیں! اونٹنک حرام ہستی تیرا صدمہ اس وقت بھی
اپنی مانتا اور محبت کا ہے، تجھ کو نہیں معلوم کہ تو نے وہ ستم کیا، جس کی تلافی
وہ ظلم کیا جس کا معاوضہ وہ قیامت ڈھائی جس کا بدلہ ناممکن محال مشکل!
محشر برپا ہو جاتا اس گھڑی جب تجھ جیسی ناہنجار عورت و سیم کے نکاح میں آئی،
زمین بھٹی تو ساقی آسمان ٹوٹتا اور تو دبتی، بجلی گرتی اور تو جھلستی اس
وقت جب تو بیٹی سے بہو، اور لڑکی سے بیوی بنی! سادات کی آبرو مانڈ کرنے
والی بہو! زناہد اور حسنین جیسے بزرگوں کے مقدس ناموں کو خاک میں
ملا دینے والی عورت! دنیا تجھ پر لعنت اور فرشتے تجھ پر ملامت بھیج رہے
ہیں، جس خاندان کے لڑکوں پر لڑکیاں قربان کیں آج اس کا ایک لڑکا
تجھ ناشدنی اور نمک حرام عورت کی بدولت جس دوام کی سزا بھگت رہا
ہے۔ منصور منزل کی چوکھٹ پر پچاس سال میں تین بہوؤں کی پالکیاں اُتریں
پہلی اما جان دوسری میں اور تیسری تو، دو مرچکیں اور تو زندہ ہے۔
مرنبوا لیاں نہ ہوں، لیکن اُن کے دیکھنے والے ابھی ہیں۔ پوچھ تباہیں گے
سُن سنائیں گے اور دیکھ دکھائیں گے، سننے والے کان دیکھنے والی آنکھیں
اور بولنے والی زبانیں کہ فنا ہونے والی ہستیوں نے کس طرح سُسرال کو
چار چاند لگا کر باپ دادا کی لالچ رکھی سُسرال پر میکہ پڑوس بگھڑا وغیرہ
پر اپنے قربان کر دیے، مگر بزرگوں کی بات پر حرت نہ آنے دیا، گھروں سے
جنازے نکل گئے مگر زبان سے غلط بات نہ نکلی!

قیمم جیسا انسان جس کی انسانیت کا ڈنکا آج بھی دنیا میں بج رہا ہے
اما جان ہی کی گود میں کا طفیل ہے، تیرا شوہر و سیم جس کو عزیزوں کی انیر

غیروں کی آنکھیں اب ننگ روہی ہیں جس کا دسترخوان مرنے کے بعد بھی دونوں وقت یتیموں کے رو برو کچھ رہا ہے، مجھ ماں کی تربیت کا معمولی نمونہ تھا!

تو بھول نہیں سکتی وہ راتیں، اور وہ دن جب میں نے اپنا ٹککہ اور چین تیرے لال پر قربان کیا، میں اُسے رات رات بھر کن سے سے لگائے ہٹلی اسلام تیری ملکیت نہیں، امانت تھا، او خائن پہو! او ڈائن ما اگر ذرہ بھر صداقت کا ظہور موجود ہے تو بول اور بتا۔ باپ نے اسی دن کو داوانے اسی روز کو اور میں نے اسی وقت کو اپنی جانیں لڑائی تھیں کہ پھولوں پر سونے والا اسلام تجھ نا بخار را کی جہالت کا شکار ہو کر جیل خانہ کی زمین پر سوئے اور جس جسم پر زلفت و خواب کے کپڑے پھٹے ہوں، آج اُس کا پیرا تن ٹاٹا اور کھیل ہوا! تیرا رنج فضول، تیرا غم بیکار، تیرا رونا عبث، تیرا اضطراب غلط تو نے جو بویا وہ کاٹا، جو دیا وہ ملا، جو ڈالا وہ پایا، تیری ہستی شروع سے آخر تک تیری زندگی ابتداء سے انتہا تک اور تیرا جسم سر سے پاؤں تک دغا کا گھر اور فریب کی جڑ ہے، شہر کے افتراق پر بچہ کے فراق پر عادت کے نکاح پر اسلام کی سزا پر تیرا صدمہ کار، تیرا رنج فریب تو اسکی مستوجب اور اسکی سزاوار، بد نصیب عورت ابھی اعمال کی سزا افعال کا نتیجہ بہت کچھ بھگتنا ہے، بھول مت اُن مظالم کو جو توڑے، اُن زیادتیوں کو جو کیں، اُس بیرحمی کو، اُس سنگ دلی کو، اُس نخوت کو، اُس تمکنت کو جس سے معصوم بوجہیں لرزیں اور کانپیں۔ تھڑائیں اور چلائیں۔ رہنے والی نہ تھی وہ طاقت جس نے بے نصیب فاسادق کے ہاتھ سے خون کی تللی بہا دی بن ماکا چپ بے کس اور بے بس تیرے قبضہ میں ضرور تھا تیری طاقت فاسادق سے زیادہ یقینی تھی، مگر ایک وقت تجھ سے بھی زبردست موجود تھی، اے بی بی آٹھ برس کا بچہ تیری

حکومت کے آگے اپنا دکھ بھول گیا، تو نے بچوں والی ہو کر معصوم کے ہاتھ سے خون بہتا دیکھا۔ اور تیرا دل نہ بیجا، جس خون نے فرشتوں کے دل لرزا دیئے حوروں کی آنکھیں ڈبڈبا دیں تو نے اپنی آنکھ سے اُسے دیکھا اور منہ پھیر لیا تیری نگاہ میں وہ خون بے حقیقت ہو۔ مگر اب بد نصیب اس خون کا ہر قطرہ اور آنکھ کا ہر آنسو زمین پر نہیں عرش معلیٰ پر گر رہا تھا، کیا دل کہہ رہا ہوگا ان بچوں کا جو کڑکڑاتے جاڑوں میں بیٹھے یا ورجی خانہ میں سکڑ رہے تھے، رات اندھیری تھی تیرے لال تیرے کلیجہ سے چمٹے ہوئے تھے اُن کے ننھے ننھے ہاتھ ایک دوسرے کی گردن میں پڑے ہوئے، دینا اُس رات کو فراموش کر جائے مگر تیرے اعمال نامہ میں وہ رات چاند کی طرح روشن ہے، یہ ستر جس نے ایک مرتبہ بھی سجدہ نہ کیا یہ دل جو ایک لمحہ خوفِ خدا سے نہ ڈرایا آنکھ جو ایک مرتبہ بھی کسی مظلوم پر نہ روئی اپنے اعمال کی سزا بھگتیں گے، اپنے کئے کا نتیجہ پائیں گے، اور اپنی غفلت کا مزہ چکھیں گے۔

جو ہو گیا وہ خیر نہیں اور جو ہو گا وہ خدا جانے مگر اتنا جانتی ہوں کہ جس کو بے کس سمجھا وہ وارث والا تھا، اور جس کو تنہا جانا وہ اکیلا نہ تھا جو کرنا تھا وہ کیا کر لیا اور کر چکی، مگر اب بے کس کا وارث مظلوم کا حمایتی اٹھا ہے بتائیگا اور دکھائیگا کہ کمزور کیسی طاقت اور لاچار بھی کچھ قوت رکھتے ہیں۔

اسلام کی سزا اس غضب کا جو ٹوٹنے والا ہے اس آفت کا جو آبنوا کی ہے ایک ذرہ بھی نہیں یہ تو بوسے ہوئے بیخ اور لگائے ہوئے پودے تھے، تیار ہو اُس مصیبت کے لئے جو اٹل ہے اُس آفت کے واسطے جو یقینی ہے اُس وقت کے لئے جو برحق ہے۔

معلوم ہے کیا تھا اور کیا کیا ہاتھ معصوم کا نہیں طاقتور کا، انگلیاں

کمزور کی نہیں زبردست کی، دل یتیم بے کس کا نہیں شہنشاہ حقیقی کا اور خون کے قطرے فاروق کے نہیں خدا کے تھے جو تیرے ہاتھوں نے گرائے اور آہ نہ کی! تیری آنکھوں نے دیکھے اور میل نہ آیا! تیرے دل نے گوارا کیا اور کھوٹ نہ لی! معاملہ بے وارث کا نہیں شہنشاہ دوسرا کا ہے تو تلی زبان کا جواب "ابھی اب نہیں" نکل کر ختم ہو گیا، اور تو سنس کر خوش ہوئی مگر پورا جواب ایک اور آواز دے گی بھولی آنکھوں کے آنسو جو لرز لرز کر نکلے، بے گناہ سینہ کا سانس جو کانپ کانپ کر باہر آیا دیکھ چکی، آنسوؤں نے جو بیج ڈالے آہوں نے جن کو سنبھا وہ کھیتی زمین پر نہیں آسمان پر تھی۔ اب ان پھلوں کو توڑ، چکھ اور کھا، اٹھا اور بھگت۔

موت زندوں کے لئے سبق اور مصیبت دیکھنے والوں کے لئے عبرت ہے۔ عمر گزشتہ تجھ کو بتا اور دنیا کو دکھا دے گی کہ راحت و الم بسا اوقات عورت کے اپنے اعمال میں دوسروں کو پہنسانے والی ہستیاں اور خوش کرنے والے انسان حق رکھتے ہیں کہ سنس اور منتظر رہیں کہ خوش ہوئے۔ لیکن دکھ دے کر سکھ پانے والی آنکھیں آج نہیں کل اور کل نہیں پرسوں آنسو گرانے والی ہیں کائنات کا مطالعہ پھونک اور دوسروں کا تذکرہ چھوڑ نظر ڈال اپنے افعال پر جو کرتی رہی وہ پاتی رہی، جو دیتی وہ ہی وہ لیتی رہی۔ فاروق کا خون تو بھول چکی ہو مگر یاد رکھ کہ وہ ابھی تازہ ہے اور رنگ لانے والا ہے، وہ حینہ قطرے کچھ قیمت وہ ننھی سی آہ کچھ اثر اور وہ معصوم نگاہ کچھ معنی رکھتی تھی وہ قطرے رائیگاں وہ آہ خالی اور وہ نگاہ بیکار نہ جائے گی، اسلامہ کا رنج کر چکی، اب اپنا فکر کر اور سن لے موت تیری تاک میں، مصیبت تیری فکر میں اور دوزخ تیرے انتظار میں ہے، نبض روح کا وقت مقرر ہو چکا ہے، مصیبت بھاگم بھاگ آ رہی ہے

اور دوزخ کے شعلے بھڑک اٹھے ہیں، غنیمت سمجھ کہ ابھی پردے میں مٹی ہے
اور گھر میں کھڑی ہے، مگر آ رہا ہے وہ وقت کہ فاروق کا خون جیتے جی موت کا
مرزہ چکھا دے گا، و سیم دہن درد رکی ٹھو کریں، گھر گھر کی بھیک ہوگی اور جس
ہاتھ سے بے گناہ معصوم کی ننھی ننھی انگلیاں ذبح کیں اس میں زخم اور
زخموں میں کیڑے ہوں گے۔

وعدہ نہیں اور نہ وعدے کا حق صلاح ہے اور وہ بھی محض دوستانہ
کہ اپنے کلیجہ کے ٹکڑے اس بد نصیب ما کے لالہ پر جس کی ہڈیاں تیری نگاہ میں
گل کر خاک ہو چکیں۔ مگر حقیقتاً جس کے آنسو آج تک جنت میں تھے قریان کفاروق
کے قدموں پر سر رکھ اس کو کلیجہ سے لگا، اور اسی دل سے جس کو دکھا چکی ہے
دعا لے، یہ وعدہ ہے اور اس لئے شب و روز کا بھرہ کہ اگر فاروق کے مجروح
دل کی کلی کھلا دی، تو دنیا کے عذاب اور آخرت کی مصیبت دونوں ہلکے
ہو جائیں گے۔“

(۸)

ہاں بیوی اب وہ وقت آتا ہے کہ گو تم یہاں فطرت انسانی کے تمام مراحل
طے کر چکیں، مگر چونکہ پہلو میں ایمان دار دل موجود تھا، اس لئے فقر اُٹھو گی کہ
کیسے کیسے انسان قصائی دنیا کا گھینہ ہیں، یہ میں ابھی کہہ چکی ہوں، کہ انتہائی
صدات نے وقت کے ساتھ آبا جان کی بصارت بھی کم کر دی تھی وہ دن کو تو ٹوٹا
ٹوٹ کر چل پھر بھی لیتے تھے، گمراہ کو تو ایک قدم بھی چلنا مشکل تھا، مگر وہ وقت
کا فائدہ اور تین آدمی دو عورتیں ایک مرد اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا تھا
کہ وہ خود رزق کی تلاش میں اور سرسراش میں نکلتے، محنت کے قابل نہیں
مزدوری کے لائق نہیں، ایک بھیک ہی ایسی چیز تھی کہ ہم بد نصیبوں کے پیٹ

میں ٹکڑا ڈال دیتی، یہ تو آبا جان ہی کا دل جانتا تھا تھا، کہ جس کے ہاتھ روپے اور اشرفیوں سے بھرے رہے اُس کے دل پر جب وہ بھیک کا قصد کر رہا تھا کیا گز رہی ہوگی، آپ مجھ سے اتفاق کریں گی مجھے پوری امید ہے کہ اگر نذوۃ کوئی حکم اور خیرات کوئی چیز ہے، صدقہ کچھ معنی رکھتا ہے تو میرے باپ سے زیادہ اس وقت کوئی مسلمان مشکل سے مستحق ہوگا، مگر افسوس یہاں ہمارا ہی طبقہ انسان اس غلطی کا ذمہ دار ہے مسلمانوں میں جس بُرے طریقہ سے خیرات ہو رہی ہے اس کا بار مردوں پر کم عورتوں پر زیادہ ہے ہسٹے کٹے، موٹے مسٹنڈے بڑے بڑے شہروں میں ۴ بجے رات کو اُٹھ کر کوئی بے نمازوں کا رسالہ کوئی ہرنی کا معجزہ کوئی کربلا کے شعرا کوئی مدینہ کی مناجات پڑھ کر چین سے تھولیاں بھرتا ہے، مردوں کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی اور یہ نہ معلوم خدا کا مقدس فرشتہ یا جنت کا داروغہ سمجھ کر نہایت فراخ دلی سے اس کی ملاقات کرتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکاؤں کی ہمت اور بڑھی اور تعداد اتنی ترقی کر گئی کہ دینے والوں کو مستحق اور غیر مستحق کا امتیاز ہی نہ رہا، اور بد معاشوں کے ساتھ واقعی مستحق بھی گھن کی طرح پس گئے، آبا جان بد قسمتی سے ایسے محلہ میں جا پہنچے، جہاں سب تعلیم یافتہ خوانین آباد تھیں اور چونکہ ان کے کان میں یہ بھنگ پڑ چکی تھی کہ اس قسم کے سائل مکا رہوتے ہیں اس لئے وہ ایسے لغو سالنوں کی التجا پر کان نہ دھرتی تھیں آبا جان نے کئی در کھٹکھٹائے مگر کسی سے ایک پیسہ یا چٹکی بھر آٹا نصیب نہ ہوا اس عرصہ میں رات کے دس بجے تھے جب ہر طرف ناکامی ہوئی تو آبا جان پاہر نکلیے۔ اب انھوں نے اس آواز کو جس کے چھپانے کی اب تک کوشش کرتے رہے علی الاعلان نکالنا شروع کیا، ان کی کمر جھک گئی تھی اُسے پاؤں میں لکڑی کا سہارا لیکر سیدھا ہاتھ

پھیلا پا۔ وہ سوال کرتے چلے جا رہے تھے کہ ایک اللہ کے بندے نے ہاتھ پر پیسہ رکھا اور کڑی پکڑ ایک گلی میں چھوڑ دیا، یہاں اُن کے کان میں آدمیوں کے شور و غل کی آواز آئی معلوم ہوا کہ ایک گھر میں شادی ہے اور مولود شریف ختم ہو کر اب غرباء کو کھانا کھلایا جا رہا ہے، اس علم نے ابّا جان کو باغ باغ کر لیا اور وہ شادی کا گھر پوچھتے وہاں تک پہنچے، میں وہاں موجود نہ تھی مگر جو حالات معلوم ہوئے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگ کھا کھا کر باہر نکل رہے اور اندر جا رہے تھے، یہ بھی ایک وقت تھا کہ جس شخص نے ایک ایک دن میں بیسیوں روپے بے دریغ خرچ کر دیئے آج اس کی انتہائی آرزو تین چار روٹیاں تھیں رات بسرعت تمام اڑی چلی جا رہی تھی اس وقت کا ہر لمحہ میرے اور ابّا جان کے خیال میں ابّا جان کے دل پر نشتر کا کام کر رہا تھا، اُن کی تمام آرزوئیں، تمام حسرتیں تمام خواہشیں صرف اس کوشش میں محدود تھیں کہ زیادہ نہیں وہ صرف دو آدمیوں کا کھانا لے کر آجائیں اور ہمارے پیٹ بھریں میں جانتی ہوں کہ اُن کی آرزوئیں غلط، اُن کی حسرت جھوٹی، اُن کی خواہش بیجا، وہ اندھے ہوئے تو کسی کو کیا اور بھوکے تھے تو مسلمانوں کی بلا سے، اُن کو کوئی حق نہ تھا کہ وہ اپنی مصیبت کا حال سنا کر چونچال دلوں کو رنجیدہ کریں مسلمان اگر مسلمان تھے تو اس واسطے تو نہ تھے کہ اپنی خوشی کی گھڑیاں بے نصیب جاہل مندوں کے مصائب سے منع کر دیں، اپنی گارڈھی محنت کا کمایا ہوا روپیہ دکوۃ یا خیرات کے بہانہ مفت خوروں کے بھینٹ چڑھائیں، بقول میری عزیز سہیلی مسز اے حسن کے کہ خاموشی کے ساتھ خیرات کرنا ہرگز اسلام کا حکم نہیں ہو سکتا جب تک چندہ کی رقم صلی الاعلان نہ دی جائے دوسروں کو ترغیب ہو ہی نہیں سکتی خیر ابّا جان کی پہلی غلطی تو یہ تھی، دوسری یہ ہوئی کہ اپنی غرض میں دیوانہ ہو کر اور یہ

نہ سمجھ کر کہ مکان مردانہ ہے یا زنانہ ہے اندر گھس گئے یہ مصیبت کا انتہائی وقت تھا، رات آدھی کے قریب گزر چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس شخص کی توقعات سوال بھی قریب قریب ختم ہو رہی تھیں جس کو بڑا اندیشہ تھا کہ مسلمانوں کی اس جماعت میں یقیناً میرے شناسا ہوں گے اور جو کل تک میرے ساتھ برابر کے بیٹھنے والے تھے مجھ کو اس حالت میں دیکھیں گے، لیکن ضرورت نے عورت اور حمیت سب ختم کر دی، مکان مردانہ ہی تھا، اور آبا جان کا قیاس غلط نہ تھا، لیکن مکان دنیا والوں کے واسطے، انتظام ہچیشموں کے لئے اور کھانا براہروالوں کے لئے تھا نہ کہ اللہ والوں کے لئے فقیروں اور کمزوروں کے لئے! آبا جان کا قدم دھرنا تھا، کہ چاروں طرف سے لوگ چنچ پڑے اور آواز سننے ہی کہنے لگے نکالو باہر نکالو کسی فقیر کو اندر نہ آنے دو، اس چوکھٹ میں دو مکان تھے ایک مردانہ اور ایک زنانہ آبا جان مڑے تو زنانہ مکان کے دروازہ میں ایک بیوی بیوی تھا نہ دار صاحب کے واسطے جو اسی وقت تشریف لائے تھے خصوصیت کے ساتھ خوان لئے کھڑی کسی مرد کا انتظار کر رہی تھیں، آبا جان آنکھوں سے معذور تھے ٹکڑ لگی اور بھرا ہوا خوان گر پڑا ایک اندھے کی ایسی عظیم الشان غلطی کی ذمہ داری گھر والی پر نہ تھی۔ بیچاری بہترین کھانا نکال کر لائی تھیں۔ اوپر کا سالن، تہہ دیگی کی بریانی، بیوی ایک لونڈی ایک ماما اور ایک مرد چار آدمی پچھڑ گھونسلاں ان پر ٹوٹ پڑے۔ اندھے تھے تو ان کو کیا اور حاجتمند تھے تو ان کی بلا سے۔ پٹ کر باہر نکلے تو سر جکڑا رہا تھا، سیڑھی پر سے پاؤں رپٹا دھڑام سے نیچے گر کر بیہوش ہو گئے، پہلے تو ایک دو آدمیوں نے ہشیار کرنے کی کوشش کی آوازیں دیں پھر ایک شخص نے ٹانگیں گھسیٹ کر الگ ڈال دیا کہ رستہ نہ رکے، سنا ہے کہ ایک بچے کے قریب گھر والی کسی بیوی کو

روشنی ساتھ لیکر دروازہ تک پہنچائے آئیں تو چہرہ پر نگاہ پڑی اور معلوم ہوا، کہ وہ اندھا فقیر جس کو مار پیٹ کر انھوں نے بھکوا دیا تھا وہ ان کا حقیقی بھائی تھا جس کا مکان چھینے کی خوشی میں آج مولود شریف اور دعوت عام تھی ایک دیکھ بھیا جان غیر تھے، ہم کو ان سے شکایت نہیں افسوس پھر بھی جان پر ہے حقیقی بہن ہو کر ایسی سنگ دل کہ نیرید اور شمر کو بھی مات کیا۔ لاکھ شوہر کی عادت اور خصالت سے مجبور و معذور تھیں، مگر ایمان رکھتی تھیں، سوچتیں کہ کیا کر رہی ہیں، خیر ہم ان کی اس ہی عنایت کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ڈولی کرتیں آدمیوں کا حصہ رکھ کر ابا جان کو گھر بھجوا دیا، بیچ پوچھو تو یہ کھانا ہم دونوں مامیٹیوں کے واسطے زہر تھا، اور ہم کو مر جانا چاہئے تھا کہ ہماری وجہ سے اس شخص نے جو باپ اور شوہر ہے اپنے فرائض کو کس طرح ادا کرنے کے بعد یہ کھانا حاصل کیا، ہائے دنیا۔ اور دنیا کا تعلق ابھی کھانا جو بھیک مانگ کر دھکے کھا کر پٹ کر بے ہوش ہو کر ذلیل ہو کر غیرت کھو کر ابا جان لائے، بیوی اور بیٹی دونوں نے زہر مار کیا!! آج ہم البتہ جس وقت کھانا کھا رہے تھے اتنا ضرور سوچتے جاتے تھے کہ افسوس ہماری غفلتوں اور غلطیوں پر مردوں کی جس کمائی کو ہم ایسی بے رحمی سے برباد کرتے ہیں، وہ کیسی کیسی مصیبت اور آفتوں سے پیدا ہوتی ہے، خدا ایسی کمائی تو دشمن کو نہ دے، لیکن اس سے اتنا پتہ تو ضرور چل گیا کہ مرد ہماری زندگیوں کے واسطے اپنے فرائض کس طرح ادا کر رہے ہیں، مامو جان جب ضلع دار تھے، ایک دفعہ صاحب نے ان کو بیوقوف کہا، سنئے ہی سنا آگیا، شہیں کھاتے تھے، کہ اگر چہنوں کا بھی سہارا ہوتا تو کہی پر لعنت بھجتا مگر کیا کروں بیوی بچوں کی بیڑی پاؤں میں ہے۔

ابا جان جس وقت باہر گئے ہیں ابا جان وضو کر رہی تھیں ہم نے پوچھا

نہ انھوں نے بتایا کہ کہاں جاتے ہیں، اور کیوں جاتے۔ چھوٹ کیوں بولوں میرے پیٹ میں تو چوبے قلا بازیاں کھا رہے تھے، ڈٹ ڈٹ کر کھایا، مگر اما جان آبا جان کی کیفیت سن اور حالت دیکھ چکر کر بیٹھ گئیں وہ آبا جان کے کہنے سے شریک تو ہو گئیں، مگر ان کی آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑپاں بہہ رہی تھیں، مجھے تعجب تھا کہ جس بیوی نے جوانی بڑھاپے سے بدل دی اور تیوری کابل نہ بدلا، آج وہ شوہر کے قدموں کی خاک بھی میں تو میں خود آبا جان حیران تھے، کہ جو بیوی تمول میں اپنی وضع کی اس قدر پابند اور اتنی خود ار کہ منت اور خوشامد تو درکنار بات بھی دب کر نہ کی، وہ اس وقت مفلسی اور مفلسی کیوں فاسقے اور مصیبت کے وقت قدموں میں کچھی جاتی تھی، جب میں اور آبا جان اپنے اپنے بچوں پر لیٹ گئے، تو اب وہ وقت آیا ہے، جب آسمان کے فرشتوں اور زمین کے درختوں نے دیکھا، کہ جو بیوی بد مزاجی اور بد دماغی کا پورا تمغہ دنیا سے حاصل کر چکی تھی، وہ کس طرح ما کے دودھ اور باپ کے خون کی لالچ رکھ کر بتاتی ہے کہ مسلمان بیوی کیا ہے، نماز عشا سے فراغت پا کر آبا جان روتی ہوئی آجائاز سے اٹھیں آبا جان اپنے اذکار میں غرق تھے، کہ دفعتاً وہ ان کے قدموں میں گریں اور سران کے پاؤں پر رکھ کر کہا:۔

”ماکی دہلیز اور باپ کے گھر سے وداع کے بعد جس کو آج پچیس سال کے قریب ہو گئے، خدا نے مجھ کو شوہر کی بیوی گھر کی گھر والی، بچوں کی ما بنایا ہمارا نکاح میری تمہاری دونوں کی ضرورت تھی بیچ نہ تھی، کہ مجھ کو تم پر اور تم کو مجھ پر ناجائز حکومت کا حق ہوتا، تم جب تک شوہر تھے میں بیوی بھی تم دینے والے میں لینے والی تم کمانے والے میں اٹھانے والی، تمہارا ہاتھ جب تک اوپر اور میرا نیچے رہا میں نے ایک تم کو نہیں دنیا کو دکھادیا کہ ما پاپوں کی ہیمہٹیاں

لوٹیاں نہیں بیویاں ہیں یہ آن پر جان اور عزت پر راحت قربان کرنے والی ہستیاں ہیں، لیکن آج جب وقت نے تمہارے ٹول کو افلاس سے اور نمکنت کو خاموشی سے بدل دیا، تو میں بیوی نہیں لونڈی ہوں، یہ سر آن قدموں پر فدا یہ جان اس صورت پر نثار ہو مجھے خیر نہیں تھی، کہ ماوہ ناشاد نامراد گئی جن رہی ہے جس کا شوہر بھیک مانگ کر اس کا پیٹ بھرے گا، موت نعمت ہوتی اگر اس سے پہلے میرا پردہ ڈھانک دیتی، کہ میں یہ سماں دیکھوں اور یہ ٹکڑے کھاؤں دولت اور عزت قدرت کے کرشمے اور دنیا کے کھیل ہیں، یہ صہرتی پھرتی چھاؤں کا غذا کی ناؤ ہے۔ شریف بیدیاں باہر والی نہیں شریف باپوں کی بیٹیاں ہیں، یہ ساون کی چڑیاں ہری چنگ نہیں، رنج کی رفیق اور مصیبت کی شریک ہیں، تکلیف ان کی شرافت کا امتحان اور خاندان کی آزمائش ہے۔ مصیبت میں صبر ان کا زیور اور فاقہ میں شکر ان کا جوہر ہے۔ چہالت ہے یا لغویت مگر میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ عورت کی تقدیر کا رزق اور مرد کی تقدیر کی اولاد۔ میری بد نصیبی نے یہ دن تم کو دکھایا۔ اس تکلیف کی وجہ اس مصیبت کا سبب اس انقلاب کا باعث میں اور صرف میں اور فقط میں۔ ممنون ہوں کہ اب بھی شکر گزار ہوں کہ اس پر بھی، تم نے میرے حقوق کا لحاظ رکھا، اور مجھ جیسی نافرمان عورت پر وہ احسان کیا کہ اگر میں پاؤں دھو دھو کر پیوں، تو معاوضہ محال اور اپنی کھال کی بوتلیاں پہناؤں تو بدلہ مشکل۔ ماکے بعد اور باپ کے پیچھے جب زندہ بہنیں جیتے جاگتے تھائی حقیقی خالائیں اور سگے ماموں ایسے فرسٹ ہو گئے کہ بہنیوں اور برہمنوں اپنی صورت دکھائی نہ میری دیکھی۔ تمہارے دم سے تمہارے کرم سے عورت آبرو کے ساتھ گھر والی بنی، اور بیگم کہلائی۔ عمر بھر تمہاری بدولت راج کیا سونا ہاتھوں میں کھیلا، اور چاندنی قدموں میں لوٹی۔ جو ہاتھ ہمیشہ زبردست رہے، وہ

اس وقت زیر نہ ہوں گے، ابھی میں زندہ ہوں اور ان ہاتھوں کا کرم میرے دل میں موجود، جب وقت نے تمہارے بلند ہاتھ خاموش کر دیئے، تو ان کا منتہا نکلنے والے وہ ہاتھ جنھوں نے ان کی بدولت کہنیوں تک سونا پہنانا حرام ثابت نہ ہونگے۔ آقا سلامی سیوں گی، پیسوں گی، مگر عین ہاتھوں کو نیچا نہ ہونے دوں گی۔“

اچھینے نے آبا جان کو محو حیرت کر دیا تھا، ان کو آبا جان سے اس قدر مایوسی ہو چکی تھی کہ وہ اس منظر کو غراب سمجھ رہے تھے۔ یقین کے بعد انھوں نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا ”مجھے امید نہ تھی کہ اس رنج میں جو صدمہ نہیں مرض الموت ہے تم اس طرح میری غمخوار ثابت ہوگی۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ تمہارے اس احسان کا معاوضہ کر سکوں۔ وقت نے مجھ کو اس قابل بھی نہ رکھا کہ بھیک مانگ کر تمہارا پیٹ بھر دیتا۔“

اتنا کہہ کر آبا جان کی طبیعت کچھ ایسی گیڑی کہ وہ بات نہ کر سکے، آبا جان کی اس سے زیادہ خراب تھی۔ انھوں نے آبا جان کے قدموں کو بوسہ دیا اور کہا۔

”یہ سران قدموں پر قربان! عیش ان قدموں سے اور عزت اس دم سے ہے۔ نادم اور شرمسار بیوی خطا وار اور گنہ گار بوٹی معافی کی خواستگار ہے۔ دولت ختم ہوئی مفلسی رہنے والی نہیں۔ وہ دن نہ رہے تو یہ بھی نہ رہیں گے۔ حق پر نظر، کوشش پر بھروسہ اور تقدیر پر یقین کرو دنیا کا وسیع میدان پیش نظر ہے۔ محنت کریں گے، اور پیٹ بھرینگے۔“

(۹)

خالق کی قدرت تو کیا مخلوق کی حماقت ہی سمجھو کہ جس قوم کے اکرام و اعزاز

کا انحصار کبھی اتفاق پر تھا اس کی نگاہ میں آج روپیہ انسانیت کا جزو اور دولت شرافت کا لازمیہ شرار دیا جائے۔ اس سے انکار مذہب کی توہین ہے کہ گلشن اسلام کی جو بہار آنکھیں غریب کی بھونپری میں دیکھیں گی وہ قصر شاہی میں نظر نہ آئے گی۔ مگر آج جو مسلمانوں کی نگاہوں میں مفلس اور بیچ ذات کے ساتھ مشقی اور پرہیزگار ہودہ سودیلوں کا ذلیل اور رذیلوں کا ذلیل انسانوں مغلائی کی لڑکی اور غریب بھٹی، مگر اس کے اعمال و افعال ایسے تھے کہ سوشلیٹ اور ہزار بھلے مانس شتر بان۔ اسلام جس روز سے کالے پانی گیا مغلائی اور سناتون دونوں ماہیٹیاں وقت کا بڑا حصہ و سیم دو ٹھن کی تسکین کرنے میں گزار دیتیں۔ اس کے ساتھ روتیں اس کے پاس بیٹھتیں سمجھانے کی کوشش کرتیں۔ بھلانے کی تدبیریں کرتیں مگر اس کا زخم کاری تھا، جو بارہ پیر اور چوبیس گھنٹے ہر وقت رس رہا تھا اوسیم جیسا شوہر قابل فخر اور لائق ناز، دیکھنے کے قابل اور دکھانے کے لائق مگر چھوٹا اور اسلام جیسا کچھ بٹا کٹا، موٹا تازہ بیمار نہ علیل جیتے جی، اُس پر جو گندری اور گندڑی نفی اُس سے اس وقت بحث نہیں۔ ذکر سناتون کا ہے ذات کی درزن، نام کی سوکن مگر ایک دفعہ ہمیں بارہا اس کے در میں اس طرح شریک ہونی کہ روئے کی آواہیں گھر بھر نے سنیں، یہ اسی کا دل گردہ تھا کہ عارف جیسے شوہر کو جو بیوی کے نام سے متنفر اور صورت سے بیزار تھا، کہہ سُنکر بھیجتی اور زبردستی پہنچاتی یہاں تک ہوا ہے کہ کبھی کبھار نہیں کئی مرتبہ کہ عارف کچھری سے تھکا ہارا آیا۔ کھانا کھاتے ہی پلنگ پر بیٹھا حقہ کی منال منہ میں رہی۔ خمر اٹے لینے لگا۔ سناتون بیٹی جاگتی رہی، اس کی اگر آنکھ کھل گئی تو خیر ورنہ خود جنگا یا، اور کہا آج بڑے گھر کی باری ہے وہاں آرام فرمائیے۔

بچہ قریب قریب ہمیشہ کو چھوٹ چکا تھا، سو کن مستقل گھر میں آبرا جی تھی مگر ہم پھر بھی کہیں گے کہ وسیم دو لہن غشس نصیب تھی۔ بچہ کا فراق اور سو کن کا وجود اگر صدمہ تھا اور اگر کیوں تھا، ضرور تھا، لیکن وہ ان دونوں میں ہماری یا کسی کی ہمدردی کی قطعاً مستحق نہیں۔ بچہ زبردستی گھر سے نکالا اور سو کن ڈولی بھیج کر گھر بلالائی۔ اب بھی اگر وہ انسانیت سے کام لیتی اور شرافت سے چلتی۔ جو گذرئی تھی گذر گئی، جو گذرتی وہ اچھی گذرتی مگر احسان فراموش اس حالت، اور کیفیت میں بھی دن رات اس کے خاندان کو اگھتی رہتی۔ کھلم کھلا اور علی الاعلان کہتی اور ڈٹکے کی چوٹ کہتی کہ ”اس کے بچے کیونکر نیچے جائیں گے شریف تو بیٹی دینے سے رہتے، رذیل کی کھپت رذیل میں، یہ ہوئے موتے درزی سے بچے بیگ، خدمتوں احسانات کا معاوضہ اور سلوک کا نتیجہ اپنے کانوں سے سنتی اور اُن ذکر کرتی۔ فرشتہ نہیں مگر فرشتہ صفت ضرور تھی، کہ سنتی مائل دیتی اور چپ ہو رہتی۔ وسیم دو لہن عورت تھی تو ہو، انسان تھی اور زندگی تھی۔ آنکھیں اور دماغ دونوں صحیح، سو کن کا معاملہ ختم کرو ضرورت تھی کہ اسلا کا فراق تربیت کے اعتبار سے کموں جلی ما کو سبق دیتا، دوسرا بچہ سلیم سا اٹھ رہا تھا، کس باپ کا بیٹا اور کس دادا کا پوتا گیا رہ برس کا لوٹھا وہی دو چار سو رہیں جو دادی کے طفیل یاد ہو گئی تھیں وہ البتہ طوطے کی طرح رٹوالو اس کے آگے آگے الفٹ کے نام بے تک نہیں جانتا تھا۔ دن بھر گلی کے آوارہ لڑکے اور گرمی کی چلچلائی دھوپ میں جا لگیہ پہنے یا لنگوٹ باندھے دریا کے کنارے کبڈی یا گچھی پالا ہو رہا ہے اندھیری رات میں نو دس اور چاندنی رات میں بارہ ایک بجے آیا، روٹی کھائی اور پڑ رہا۔ دنیا ہی نے نصیب ما کو سمجھایا، مگر مرے اس کی ماجو کبھی تھوٹ موٹ بھی بچے کو آدھی بات

کہی ہو، بلکہ الٹا کہنے والوں ہی کو ڈانٹ دیا کہ سیانا بچہ کیا سنہ لگوں۔ بُری لگ گئی
 نکل کھڑا ہوا۔ کسی کا کیا جائے گا۔ میں ہاتھ جھاڑ بیٹھ جاؤں گی۔ اس غفلت کا
 نتیجہ ظاہر تھا کہ جس نسیما نے اُن بچوں کو جن کی ساٹ پشت میں بھی کوئی پڑھا
 لکھا نہ تھا عالم اور فاضل بنا دیا اس کا پوتا مرے سے گھنچ پالا کھیلتا اور دُھڑے
 سے کبوتر اُڑاتا۔ کبھی آم پر چڑھے کیریاں توڑ رہے ہیں۔ کبھی اٹلی پر چڑھے کنارے
 توڑ رہے ہیں! سلیم و سلیم کا بچہ نہیں رانڈ کا سانڈ تھا کہ گھر میں رہتا تو
 اور باہر جاتا تو جدھر نکل جاتا تراہ تراہ مچ جاتی۔ اس کو مارا اس کو دھاڑیہاں
 لوٹ ویاں کھسوٹ، چاروں طرف سے شکایتیں تھیں۔ مگر صد آفرین اس
 بد نصیب ماکو یہ سب کچھ آنکھ سے دیکھتی، اور کان سے سُنتی، مگر ٹس سے مس نہ ہوتی،
 خدا دشمن کو بھی ایسی بد بخت، انصیب نہ کرے جیسی اسلام اور سلیم کو میسر آئی،
 یہ درست ہے کہ باپ سر پر موجود نہ تھا، مگر بچوں کی تربیت کا واسطہ باپ سے
 برائے نام ہے درحقیقت ان کی تربیت کی ذمہ دار ما اور بے شک ما۔ و سلیم
 دُھن بچہ کی عاشق تھی فریفتہ تھی، شعیدا تھی، مگر انوکھی نہ تھی، ہر ماہوتی ہو
 اس کا اگر ایک کھوکرا ایک بچا تھا تو سو کن کے بھی گرے پڑے نہ تھے۔ گود کا
 بچہ ڈیڑھ پونے دو برس کا ہو گا دیکھ دیکھ کر جیتی تھی، گھر میں آئی کا چھن بچہ نے
 لوکاٹ مانگے۔ فوراً منع کر دیا تڑپا لوٹا، ضد کی ایڑیاں رگڑیں کوٹھری میں لیجا
 بند کر۔ منہ ڈھانک چپکے سے آپ بھی لیٹ گئی۔ مگر اس کی ضد پوری نہ ہونے
 دی، بچہ کو تکلیف ضرور ہوئی۔ اور بچہ سے زیادہ ماکو گریہ سبق عمر بھر کو کافی تھا،
 ایک بی و سلیم دُھن ماتھیں کہ بچہ کی گولیوں کے واسطے پر محلہ قرض کیا، اور اس
 کی خواہش پوری کی۔ تربیت کی اس غفلت کا نتیجہ آنکھیں شب و روز دیکھ
 اور کان رات دن سُن رہے تھے، ہوا سی واسطے ہزار برس کی نیو،

کہلاتی ہے کہ عمارت خاندان کی بنیاد اس کے خیالات پر ہے، اگر اس نے اپنا فرض سمجھ لیا اور بچوں کی تربیت درست کر دی تو خاندان کو چار چاند لگا دیئے اور اگر کانوں میں تیل اور آنکھوں میں پھلیاں ڈالے بیٹھی رہی، بچوں کو پیٹ بھر کر بگڑنے دیا، تو بزرگوں کی آبرو اور خاندان کی عزت سب خاک میں ملا دی دہن بننا، کہنے کو مشکل نہ ہو، مگر اس کی ہمت میں وہ سخت ذمہ داری مضمر ہے جس نے خاندان بنا اور بگاڑ دیئے۔

جون کے مہینہ میں دوپہر کے وقت سنسٹرن اندر کے کمرے میں بیٹھی روٹل پر عادت کا نام کاڑھ رہی تھی کہ سمجھلا لڑکا دوڑتے پانچ برس کا اٹا سے کہنے لگا، کیڑے اُتار دے ہناؤں گا۔ کہنے والا بچہ نا سمجھ، سننے والی گدھی کہ سننے ہی تعمیل کو فوراً تیار ہو گئی، کرتا اور پا جامہ دونوں اُتار دیئے، شب بھری ہوئی پانی ٹو میں اونٹ رہا تھا، بچہ غریب جا بیٹھ گیا۔ سنسٹرن کا یہ بچہ عجیب قسم کا بچہ تھا، اتنا سکین، اتنا غریب، اس قدر خاموش اور بے نفس بچہ دیکھنے میں تو کیا سننے میں بھی کم آیا ہے۔ رحم اس کی صورت دیکھ کر اور پیار اس کی کیفیت سن کر آتا تھا۔ صندیا ہٹ تو درکنار دن رات میں گنتی ہی کی چند باتیں کر لیتا ہو تو کر لیتا ہو۔ عید یا بقر عید ہو یا بیاہ ہو اس کو اچھے کیڑے سے واسطہ تھا نہ نئی جوتی سے۔ جو مل گیا وہ لے لیا، جو آ گیا وہ پہن لیا، اس کی محسوسیت پر ما اور باپ دونوں کا کلیجہ کٹتا تھا، سنسٹرن لاکھ پوچھتی عادت ہزار کہتا، مگر وہ ایک خاموش نگاہ سے دونوں کی صورتیں تنک کر نظر نیچی کر لیتا۔

ما اور باپ دونوں کی زندگی میں اس کی صورت پتی پتی برستی تھی ایسا مردہ دل اور خاموش طبیعت، بچہ اس عمر اور اس وقت میں خدا ہی کی قدرت

تھی، باپ اگر بھولے بسرے گھر کے دیتا ماحل بھن کر مار دیتی تو دونوں گھنٹوں پہنچتے اور افسوس کرتے۔ ایک رات پہلے کا ذکر ہے کہ لکھنؤ سے کسی دوست نے عارف کو خبر بوزے بھیجے تھے۔ سب تقسیم کر کے نستانوں نے دونوں قابوں میں قتلے گھر کے واسطے رکھے، ایک عارف کے واسطے ایک بچوں کے لئے عارف کھری چلا گیا، تو بچے بیٹھے۔ فصل کا میوہ باہر کی سوغات ٹوٹ پڑے اور دم بھر میں قاب صاف کر دی۔ مگر اس معصوم نے اپنی سالن کی طاشتری سے کام نہ کھا۔ جب خرابوڑے ختم ہو گئے اور ماہی پوچھا "ارے تو نے بھی کھائے، تو بڑے نے کہا" اس نے تو ہاتھ بھی نہیں لگایا، اور وہ مکی صورت دیکھ کر خاموش ہو گیا، اب ماکو جو چند قتلے شوہر کے ساتھ کھائے تھے نہ رہتے۔ اس خیال کے آتے ہی کہ میں نے کھائے یہ محروم رہا اس کے دل پر جو گزری ہوگی وہی جان سکتی ہے۔ دن بھر اس کا منہ دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں گڑبڑ رہی۔ شام کو نہلایا۔ کپڑے بدلے اور کہا جا تو بھی تھوڑی سی دیر کے لئے باہر ہوا، وہ ادھر گیا، آپ اس لئے کہ میاں کے آنے کا وقت تھا، جھاڑو بھاڑیں لگی۔ ماما میں خدا کی عنایت سے دودو تین تین موجود تھیں مگر اس کا کام زیادہ تر خود ہی کرتی تھی۔ چار تیار کی، انڈے تھے۔ حقہ بھر کر آرام کر سی درست کر رہی تھی، کہ عارفناچہ کا کان پکڑے غصہ میں لال اندر آیا، اور دو تھپڑ اس زور سے مارے کہ بلک گیا۔

نستان "کیا ہوا؟"

عارف "ہوا کیا خاک، بڑے گھوڑے کی کاٹھی بالکل ناس کر دی چاقو اور قینچی سے کتری ہے۔"

نستان "اے ہے۔ یہ تو ایسی باہر گیا ہے مشکل سے پانچ سات منٹ ہوئے ہونگے۔"

عارف۔ اب مجھے کیا خبر یہی وہاں کھڑا تھا، میں نے پوچھا یہ کیوں برابر دو کی تو خاموش ہو گیا۔

عارف یہ کہہ ہی رہا تھا، کہ سائیس نے دروازہ پر آکھیا، ”سیر کا رسولیم میاں نے کتری ہے، جب میں آیا ہوں، اس وقت میری صورت دیکھ کر بھاگے ہیں“۔
بچہ کے دونوں کتوں پر پانچ انگلیاں اڑی ہوئی تھیں، اور کان پر بھوٹی ہو رہا تھا، آنکھ سے آنسو بہ رہے تھے مگر ہاں یا نا کا جواب اب بھی نہ تھا،

باپ نے سر پر ہاتھ پھیر کر اپنی ندامت کا اظہار کیا، اور مانے گلے سے لگا کر معصوم کی بے گناہی اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا، رات آپکی تھی بچہ پڑ کر سو گیا، مگر دونوں ماں باپ دیر تک اس حالت میں افسوس کرتے رہے۔

ننگا بدن، نیچے پانی، اوپر لو، باہر نکلا، تو حرارت اور حرارت کے ساتھ ہی بخار، کپڑے پہن رضائی اوڑھ گھڑی چارہ پانی پیر جا پڑا، ماکو خبر نہ باپ کی علم نوکروں کو اطلاع نہ اتا کو آگاہی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پڑا لیکن فہر کے واسطے جو مسٹر بن باہر نکلی اور یہاں لیٹا دیکھا، تو پوچھا ”بیٹا اس طرح کیوں پڑا ہے“ جواب نہ ملا تو پاس آئی آنکھیں دیکھیں تو بند۔ پنڈا دیکھا تو آگ۔ گھر آگئی۔

اٹھایا اندر لائی، لٹایا، اماؤں سے پوچھا، اتنا سے دریافت کیا، تو معلوم ہوا کہ گھنٹہ بھر پانی میں غوطے لگاتے، سب سے پہلے اپنی غفلت کا افسوس ہوا، کہ اگر فرائض کی ذمہ داری محسوس کرتی اور تربیت میں تساہل نہ ہوتا ہو تو یہ وقت کیوں دیکھنا پڑتا۔ مگر لگی کے آگے تربیت کا خیال تھا نہ تغافل کا، شام کو عارف آیا، رات کو ڈاکٹر اور حکیم، تجویز ہوئی، کہ لو لگی، دس بجے ہو گئے، حکیم صاحب نے فرمایا ”آم کی کیری بھجھا کر پلا دو“

رات نیا دہ آگئی، کیری کا ملنا مشکل تھا، اتنا نے کہا ”یڑی میوی کے مال

بہت سی رکھی ہیں، "لنستون کہنے کو کیسی ہی زیر ہوا مگر طبیعت کی اتنی سیر تھی کہ سوکن کی شرمندہ آسان کبھی نہیں ہوئی، اس وقت بھی اس نے کچھ سوچا، مگر استعارات پر غالب آئی اور یہ تمام عمر میں پہلا اتفاق تھا، کہ لنستون جیسی غیور عورت سوکن سے مدد کی ملتی ہوئی؟

وسیم دِلہن اگر اربان سے نہیں صرف انسانیت سے کام لیتی، تو اس کی گردن کیا رگ رگ لنستون کے احسانات سے دبی ہوئی تھی، کیریاں کیسی اگر خود بھی قربان ہو جاتی تو اس کے معاوضہ سے سبکدوش نہ ہوتی لیکن انسانیت ہوئی، تو یہ نوبت ہی کیوں پہنچتی، آدھی رات کا وقت تھا جب لنستون نے آکر کہا۔
 "میرا منجھلا بچہ بچا رہیں تو تھک پڑا ہے، لو لگی ہے، حکیم صاحب نے کیریاں بتائیں ہیں، اس وقت باڈا رہندہ ہے، آپ دو تین کیریاں دیدیجئے۔"

وسیم دِلہن: "مجھے کیریاں دینے میں تو عذر نہیں، مگر بچے سب برابر ہیں، سلیم میاں شوق سے توڑ کر لائے ہیں، وہ اللہ رکھے اب آتے ہوں گے، اُن سے پوچھ کر تو تین کیا چھ دیدوں گی"

اس کا جواب لنستون نے کچھ نہ دیا، اور خاموش آکر بچے کے سر ہانے بیٹھ گئی۔
 بخار لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہا تھا، اور جسم کی یہ کیفیت تھی کہ ہاتھ دھرنا مشکل تھا، چنے چھن رہے تھے، یہ وقت لنستون پر عجیب مصیبت کا تھا، بچہ کی بیہوشی بدستور تھی۔ وہ اگر چھینا چلاتا تو شاید اس قدر پریشان نہ ہوتی۔ خاموشی نے دل ہوا کر دیا تھا۔
 پنڈا دیکھتی تھی، آواز دیتی تھی، اور کلیجہ پر ایک گھونسہ مارا سے کر چپ بیٹھ جاتی تھی۔
 اس وقت جس خیال نے کلیجہ کے ٹکڑے اڑا دیئے، وہ اس کی مسکینی اور اپنی لاپرواہی سوچتی تھی، کہ دُعا اب بچتا نہیں۔ چار سال کے واسطے میرا مہمان تھا۔ مجھ سے زیادہ بے فیسیب۔ اور کون ہو گی۔ ایک لمحہ اس پر توجہ نہ کی۔

معصوم بے گناہ پٹا اور خواجہ گٹا، ہائے اللہ میں خربوزے کھاؤں اور یہ تر سے کان مٹرخ، گلے لال ہو جائیں۔ مٹر مٹر باب کا منہ اور میری صورت دیکھے اور اُٹ نہ کرے! ایس نہ پستکا کہ لپٹ کر قربان ہو جاتی۔ بلائیں لینی تھی۔ پیار کرتی تھی۔ بلبلائی تھی اور روتی تھی کہ بچہ نے آنکھ کھولی۔ دیکھا تو ماں دما روں رو رہی ہے معصوم نے ہاتھ اس کی گردن میں ڈال دیئے، اور کہا آتا جان رو وہ نہیں۔ دیکھو بھارنگیا میں اچھا ہوں، ایک سنسنی سی آئی، اور بدن تھر تھر کانپنے لگا۔ بچہ پر اتنا کہہ کر غفلت طاری ہو گئی۔ رات خاموشی کے ساتھ حدود صبح کی طرف رواں تھی، اور ایک روشن چہرہ نسرتون کے لال کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ مامی خاموش آنکھیں محبت کے چہرے پر تھیں۔ اور ماما ہر پہلو سے نا اُمیدی کا یقین لا رہی تھی۔ کبھی عالم خیال میں اس کا کفن سامنے آتا تھا۔ اور کبھی غسل میت کی نیاریاں گھر میں دکھائی دیتیں۔ ہائے کرتی اور کرتی۔ واسے کرتی اور اُٹھتی۔ دفعۃً ایک خاص خیال دل میں پیدا ہوا، دماغ چکرایا۔ اور کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ دیواروں کو دیکھ کر کہنے لگی۔ وہ بلنصیب مسافر جس کی جہاں نوازی ایک دن مانہ کر سکی۔ اس وقت تم سے رخصت ہوتا ہے، بیٹھ گئی اور سوچنے لگی، اب بچے کی عمر گزشتہ کا ہر لمحہ آنکھ کے سامنے تھا۔ ہر واقعہ کو یاد کر کے کانپ رہی تھی آپ گھر کے کام میں مصروف ہے بچے لڑ بھگڑ کے پراٹھے کباب لے رہے ہیں۔ وہ خالی طشتی لئے اس اُمید پر خاموش بیٹھا ہے کہ ان سے فارغ ہو کر مجھ کو بھی کچھ دیدیں تو کھالوں حقیقتہ میں سے رات کو واپس آئی، سب بچے مزے سے بچھوڑوں پر لیٹے کہانیاں اور پہیلیاں کہہ رہے ہیں اور وہ کھڑی چارپائی تکبہ نہ بچھونا، بے خبر بڑا سو رہا ہے پر واز خیال چھری کی طرح ذبح کر رہی تھی، کہ وہ وقت یاد آیا۔ جب پھوٹی بچی کی سپلاش بہ سخت ہمارے پیڑی تھی۔ حکیم ڈاکٹر بھی حیران ہو گئے آپ پلنگ

پرسٹری بخاریں ہلہلا رہی ہے۔ بڑے بچے باہر تخت پر بیٹھے آموں کے حصے کر رہے ہیں۔ اور سونے نیندے نیندے ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہے۔ اسے اللہ میری انا جان کو اچھا کر دے، سنسنون کیا جانی دشمن بھی ہونا بلبلا جاتا، ان ہاتھوں کو اٹھا کر کیچر سے لگا لیا، اور ساتھ ہی خیال آیا، کہنا تھا، اللہ اللہ کرو، اٹھوں خدا سے دعا مانگوں۔

سنسنون ناز کی سختی سے پابند تھی، یہ نماز کا وقت بھی نہ تھا، مگر اٹھی وضو کیا جانا زبکچا نا چاہتی تھی، کہ خیال آیا، مجھے اس مصیبت میں خدا سے مدد کا حق بھی حاصل ہے یا نہیں، میں بھی کبھی خدا کی مصیبت میں کام آئی۔ جو وہ میرے کام آئے، مگر توبہ توبہ نعوذ باللہ کیا کہہ رہی ہوں، لیکن کیوں جب ستیم اور مسکین کی صورت اسی کی صورت ہے، تو حاجتمندوں کی حاجت اور بے نصیبوں کی مصیبت بھی اسی کی مصیبت ہے۔ کیا اس سے پہلے کسی حاجتمند کا بیمار بچہ اسی طرح میری آنکھ کے سامنے نہیں آیا۔ ضرور آیا۔ بڑی بی کا نواسہ سیعادی بخاریں ۲۱ روز اور اکیس رات میری آنکھوں کے سامنے پڑا رہا۔ میں نے بڑھیا نانی، راند اور ستیم بچے کو کیا مدد دی وہ حاجتمندوں کی حاجت نہیں خدا کی اور مرصیوں کی اعانت نہیں مالک برحق کی تھی، ما سامنے والی کوٹھری میں تڑپ رہی تھی، اور میں اپنے مکرے میں ہنس رہی۔ نانی معصوم کو دیکھ دیکھ کر ہلک رہی تھی اور میں بچوں کے پاس بیٹھی تھپتھپ لگا رہی تھی، اسی خود غرضی، اسی نفسانیت اور اسی حوائیت پر میں آج کیا حق رکھتی ہوں۔ کہ خدا سے اعانت چاہوں فرشتے میری التجا میرے منہ پر پڑک دیں گے، یہ درخواست بے جمعی، یہ التجا بے غیرتی کس منہ سے سامنے کروں۔ کس پر تے پر سامنے آؤں اور کس بل پر مدد مانگوں اگر تمام عمر میں ایک دفعہ بھی خدا کا کام کرتی، تو آج وہ میرا کرتا۔ میں مانگتی اچھی

اور وہ دیتا بھلا، لیکن اب تو میرا مانگنا شرم اور اس کا دینا کرم۔
 رات ختم کے قریب پہنچ چکی تھی، چاند مدہم اور تارے جھلجھلا چلے تھے چراغ
 کی روشنی آمد صبح کا پیام دے رہی تھی، نسلتون ان ہی خیالات میں غلطان
 پہچان تھی، اور عادت پڑا سو رہا تھا، نسلتون کی نظر اس وقت بچے کے
 چہرے پر نہیں آسمان کی جانب تھی۔ کہ رات کے سنائے میں عادت کسمسایا
 اور اس کی زبان سے نیند کی حالت میں یہ الفاظ نکلے۔

”زبان دے اور سچی دے، بچہ لے اور اچھلے“
 اتنا کہہ کر عادت کلمہ پڑھنا اٹھ بیٹھا، ہر چند نسلتون نے پوچھا کہ کیا کہہ
 رہے ہو، مگر وہ کچھ نہ بتا سکا، نسلتون اس کو صدائے غیبی سمجھی اسی وقت
 سجدے میں گری۔ اور کہا۔

”مولانا ندرست دُؤف کو کلیجہ سے چمٹوا دے، وعدہ کرتی ہوں کہ ہر
 یتیم کو دُؤف سمجھوں گی“

اٹھی رات کی سیاہی پردہ دنیا سے دور ہو رہی تھی یہ پوچھت رہی تھی
 اور آسمان شب سیاہ کو دداع کر رہا تھا، فجر کی نماز پڑھی بچے کے پاس آئی دیکھا
 تو پسینہ میں شورا شور تھا۔ خوشی کے مارے اُپھل پڑی دُؤف اچھا ہو گیا، مگر
 اُس روز کے بعد کوئی یتیم بچہ نسلتون کے سامنے ایسا نہ آیا، جس کو دیکھتے
 ہی اُسے بچوں کی طرح کلیجہ سے نہ لگایا ہو۔

(۱۵)

”تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب میں مسلمانوں کے اس طبقہ پر نظر ڈالتی
 ہوں، جو تعلیم نواں میں دن رات سرگرم ہے، اور جو قدامت کو برا بھلا کہتا،
 نئی نئی وضع کی لڑکیاں پسید کرنے کی کوشش کر رہا ہے، یہ کچھ وقت کا تقاضا

اور شاید انسان کی فطرت ہوگی، میں آج تمہارے سامنے تعجب کر رہی ہوں، زندگی میں اسی فریق کی ہم خیال تھی، اگر کسی بڑی بوڑھی پر نظر پڑ جاتی تھی، تو اس کی سادگی اور جہالت پر بے اختیار ہنسی آتی تھی اور دل چاہتا تھا، کہ مسلمانوں کی لڑکیاں پردے کو پھونک اپنی ترقی کا فکر خود ہی کریں، میں دن رات تعلیم یافتہ لڑکیوں کو دیکھتی تھی، اور دیکھتی کیا ملتی تھی، جلتی تھی اور ان کو دیکھ کر یہ خواہش پیدا ہوتی تھی، کہ کیا مبارک ہو گا وہ وقت جب قوم میں ہر لڑکی اس قابلیت اور لیاقت کی ہوگی، مگر اب جو خیال کرتی ہوں تو اپنی غلطی پرندامت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، اور یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے، کہ تعلیم یافتہ لڑکیوں پر یہ مثل اصل ہے، کہ دلی کی دل والی منہ چکنا پیٹ خالی، ظاہر کی شو شاں تو مطلقاً یہ وہ سب کچھ تھا، مگر اندر کچھ نہیں پتا

میرا یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا، کہ انا جان کی زندگی اب شروع ہوئی تو بڑھاپا تھا، اور جوانی ختم ہو چکی تھی، مگر وہ زندگی زندگی کہلائے جانے کی مستحق نہ تھی۔ مجھے حیرت ہوتی تھی کہ صبح سے شام تک وہ سوئی کے دوڑے میں مصروف رہیں، اور مغرب سے قبل انھوں نے ایک کنکھی ایسی بے نظیر تیار کی کہ ہمارے پڑوس میں جو درزی رہتا تھا وہ دیکھ کر پھر ٹک گیا۔ اور اسی وقت دو روپے نکال کر بھیج دیئے۔ اُس روز سے یہ معمول بندھ گیا کہ ایک کنکھی روز دہ تیار کر دیتیں، اور درزی آنکھ بند کر کے دو روپے بھیجتا، ابتدا میں تو کچھ دقت ہوئی، لیکن جب پھر پڑ گیا اور کچھ روپے جمع ہو گئے، تو سب سے پہلا کام انا جان نے یہ کیا کہ بننے کی چاپٹ بند کر اکٹھا سودا گھر میں بھروا دیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ جس گھر کے مالک کو زمانہ کی گردش نے دو روٹیوں کے واسطے بھیک منگوائی۔ آج اس گھر والی کے سلیقہ سے آٹھ بوریاں آٹے کی موجود تھیں

اما جان ایک روپیہ روز اٹھائیں اور ایک بچا قتی تھیں، اس ایک میں سے بھی ایک پیسہ اللہ کے نام کا اور ایک محفوظ۔ جو ان بیٹی گھر میں موجود تھی اور اس کا سہم کچھ نہ تھا، پیاموں کا سلسلہ موجود اور آنے والوں کا تانا بندھا ہوا تھا، اب انھوں نے گھر کی درستی پر توجہ کی، اور جہاں کتے لوستے اور خاک اڑتی تھی وہاں ایک تین ہی ہینے میں دریاں اور چاندیاں بچھو ادیں، اما جان کی آنکھوں کے واسطے ڈاکٹر ستور روپیہ مانگتا تھا اور گو اما جان نے کئی دفعہ کہا کہ اللہ جلد روپیہ کا انتظام کر دے گا مگر وہ ٹھنڈا سانس بھر کر چپ ہو گئے اور کچھ جواب نہیں دیا، ایک روز کا ذکر ہے، نماز صبح کی فراغت پانے کے بعد وہ اما جان کے پاس آئیں اور کہاں

”ذرا اس بڑی سہری پر لیٹ جاؤ میں نے ڈاکٹر کو بلوایا ہے وہ آج انشاء اللہ آنکھیں درست کر دے گا“

اما جان: ”نہیں نہیں سو روپیہ بہت ہیں“
اما جان: ”اب تو میں انتظام کر چکی، روپیہ ہاتھ کا میل کیا آنکھوں سے زیادہ ہے۔ قربان کیا تھا ستم ایسا خیال کیوں کرتے ہو۔“
اما جان: ”میں تمہارے احسانات کا کہاں تک شکریہ ادا کروں۔ تم نے مجھے بتا دیا، کہ بیوی عورت نہیں جنت کی نعمتوں سے ایک نعمت ہے، مذہب یہ کہتا ہے کہ اگر خدا کے سوا کسی کو سجدے کا حکم ہوتا تو بیوی شوہر کو کرتی۔ مگر میں یہ کہتا ہوں کہ اگر گناہ نہ ہوتا تو میں تمہاری پرستش کرتا۔“
اما جان یہ سنتے ہی اما جان کے قدموں میں گر پڑیں، اور کہا ”کیا کہہ رہے ہو“
”خدا مجھے گنہگار نہ کرو“

وہ یہ کہہ رہی تھیں کہ ڈاکٹر آگیا، وہ خود اما جان کو پکڑ کر سہری پر لے

گئیں، اور ڈاکٹر نے آنکھیں بنا دیں، ۴۰ روز تک ابا جان نے جو خدمت کی ہے، میں تو یہ کہتی ہوں کہ میں نے اس کی مثال دنیا میں نہیں دیکھی؛ ڈاکٹر نے کہا ”طبیعت پر غصہ نہ آنے پائے“ انھوں نے تجوری پر پل نہ آنے دیا، کیا کوئی ماما یا لونڈی کرے گی، جو انھوں نے کر دکھایا اور پھر لطف یہ ہے کہ گھر کے کام کاج اور اپنی نسلائی میں رتی بھر فرق نہ آنے دیا، ابا جان کی آنکھیں چالیس دن میں تارا ہو گئیں۔ اور اب یہ وہ گھر تھا کہ جس میں کبھی سچی محبت یا کرم کی جھلک نہ دیکھی یا اب ہر نگاہ محبت اور احسان سے لبریز ہوتی تھی۔ ابا جان کا اعتراف تو صاف تھا، لیکن ابا جان کی حالت میں یہ دیکھتی تھی کہ اس خدمت اور ریاضت پر بھی ہمیشہ یہ ہی سمجھتی تھیں کہ کچھ نہیں کر سکتی اور بیوی کے جو فرائض ہیں ان کی ادائیگی میں وہ قاصر ہیں، یہ ان کی کسر نفسی نہیں بلکہ یقین تھا اور اس وجہ سے وہ اکثر روتیں اور ابا جان سے اپنے پچھلے قصوروں کی معافی مانگتی تھیں۔

نہ معلوم آپ کو میری رائے سے اتفاق ہو یا نہ ہو، میرا تجربہ تو یہ ہے کہ دنیا میں مفلسی کی تکلیف اُسی گھر میں زیادہ ہوتی ہے، جہاں میاں بیوی میں موافقت نہ ہو۔ اس موافقت پر مفلسی ہو یا فقیری سب شریبان اس نعمت کے آگے ہر رحمت رحمت اور اس جنت کے سامنے ہر اذیت راحت اور ہر کلفت عشرت۔ شریف میاں بیوی کی اعانت قدرت جی کھول کر اور فرشتے ہاتھ بڑھا کر کرتے ہیں۔ زمین ان قدموں کو مرجھا کہتی ہوئی سر آنکھوں پر رکھتی ہے اور آسمان ان ہسینوں کو مبارک باد دیتا ہوا برکت نازل کرتا ہے۔ دیکھا یا سنا تو نہیں، مگر پڑھا ہے کہ پردہ دنیا پر کسی زمانہ میں مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت بھی آیا دتھی، کہ وہ دوسرے کی تکلیف و راحت کو اپنی تکلیف و راحت

سمجھتے تھے، آنکھ اور کان کا تجربہ تو اس کے سراسر خلاف ہے، ہوں گے،
مگر ہم نے تو یہ دیکھا، کہ ادھر تو خدا کی برکت میاں بیوی کی محبت میں ہمارے
گھر پر نازل ہوئی۔ ادھر لوگوں کے کان کھڑے ہوئے۔ استقلال عجیب چیز
ہے۔ یہ انسانی زندگی کا بیش بہا جوہر ہے۔ اگر آما جان کا جی چھوٹ جاتا، تو ہمارے
فقیر مرنے میں کس رہی کیا رہ گئی تھی۔ ہم بھیک مانگتے، بڑوں کی آبرو خاک
میں ملتی۔ آئندہ نسلیں نامراد ہوتیں۔ اُنھوں نے ناکامی میں کامیابی کا راز
دیکھا۔ اور نفرت میں محبت کی جھلک دیکھی۔ لونڈی بن کیا، اور بیوی بن
کھایا۔ وہی ہمارا گھر جس میں خدا کا نام بھولے سے بھی کوئی نہ لیتا تھا اب
ایسا تھا کہ بچہ بچہ نماز پڑھتا، عبادت کرتا۔ کمائی تھی، اور سلیقہ تھا تو
صرف آما جان اور فقط آما جان کا۔

چند ہی روز میں ہماری حالت کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ اب عزیزوں
میں چرچے شروع ہوئے۔ کوئی کہتا تھا دولت نکلی۔ کسی کا خیال تھا جوتے
مگر عقلمندانہ سمجھ سکے کہ نیک بیوی، فقیر میاں کو بادشاہ بنانے کی
طاقت رکھتی ہے۔ عورت کا صبر اور استقلال ایک لازوال دولت
اور قدرت کا وہ نور ہے جو زمین سے نہیں اس کے دل سے نکلتا ہے اور
گھر کے در و دیوار تک منور کر دیتا ہے

بقرب عید کی ساتویں نارنج تھی۔ آما جان نے گھر میں سپیدی اور تمام
برتن فلجی کروائے۔ اُنھوں کو مکان کے چپے چپے میں بچھو نا ہوا، نویں کو جہان
آنے شروع ہوئے، کنبہ بھی اور محلہ بھی، پھوپھی بھی اور پھوپھا بھی،
گھر آدمیوں سے پٹا پڑا تھا، جب صبح صادق نے رات کو ودار کیا
اور روز روشن کے آنے کی تیاریاں ہوئیں تو آما جان نماز فجر جماعت سے

پڑھنے کے بعد گھر میں آئے، اُنھوں نے آما جان کا ہاتھ پکڑا اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

یہ وہ روز اور وہ وقت ہے، کہ تیری بے شمار مخلوق تیرے اس گھر میں حاضر ہوئی جس کی بنیاد ان مبارک ہاتھوں سے پڑی جن کے واسطے آگ کے وہ شعلے جو آسمان سے اُٹھ کر رہے تھے گلزار ہوئے۔ یہ وہ دن اور ساعت ہے جب تیرے ہزاروں لاکھوں بندے ایک جگہ جمع ہو کر اس واقعہ کو تازہ کر رہے ہیں۔ جب تیرے ایک نبی برحق نے اپنے کلیجہ کا ٹکڑا نذر چڑھا کر دنیا کو دکھا دیا۔ کہ کس طرح نیک بندے اولاد اور مال تجھ پر سے قربان کر دیتے ہیں۔ یہ وہ گھڑی اور وہ لمحہ ہے جب تیری لازوال طاقت کے روبرو سر جھکانے والے انسان اس پیام کی تعمیل میں جو اس مبارک زبان سے ہم تک پہنچا۔ جو متواتر فاقوں اور پے درپے اذیتوں میں تیری یاد سے علیحدہ نہ ہوتی، اپنے قصور پر نادم ہو کر تجھ سے معافی کی طلبگار ہیں۔ اس وقت ایک گنہ گار انسان ایک ناکارہ مسلمان اس لئے کہ اس کے اعتقاد اس قابل نہیں۔ اس واسطے کہ اس کی حالت اس لائق نہیں کہ کعبہ خلیل میں حاضر ہو کر عرض کرتا اس سر زمین پر اس جماعت کے روبرو تجھ سے ملتی ہے کہ یہ عورت جو بیوی کی حیثیت میں اس وقت میرے ساتھ تیرے دربار میں حاضر ہوئی جس نے ایک عالم کو دکھا دیا کہ کس طرح ایک مسلمان بیوی اپنے فرائض ادا کرتی ہے۔ جس نے ایک دنیا کو بتا دیا کہ کس طرح سلیقہ شعار عورت فقیہ کے گھر کو بادشاہ کا محل بنا سکتی ہے، طفیل ابراہیم کا جو خلیل تھا، واسطہ اسمعیل کا جو ذبیح تھا، اور تصدق اس احمد کا جو محبوب تھا، اُس کے گزشتہ گناہ معاف کر، اس النجا کو خانہ کعبہ کی قبولیت

اس زمین کو بیت اللہ کا درجہ اس سائل کو مستجاب الدعوات کا درجہ عطا فرما۔
گئی ہوئی عزت پھوٹی ہوئی آنکھیں۔ اس کی بدولت بیسرا میں عطا کرنے
والا تو لینے والا میں۔ دینے والا تو، دلوانے والی یہ۔ تو نے بغیر آنکھوں کے وہ
منظر دیکھا جب گرمی کی چالچالاتی دھوپ میں بسیریاں لگائے اور چھتیرے پہنے
اندھے شوہر کا پیٹ بھرنے کے لئے اس نے کنٹھیاں سیں اور تیوری پر
بل نہ آیا۔ تو نے بغیر کانوں کے وہ الفاظ سنے جب مجھے کس وبے بس اپانج
اور لاچار شوہر کے قدموں پر سر رکھ کر اس نے گر گڑا کر کہا۔ جب بیوی تھی اب
لونڈی، جب بیگم تھی اب کینڑی

میرا ٹوٹا ہوا دل جوڑنے اور میری چھوٹی ہوئی ہمت بندھانے والی یہ
ہستی۔ یہ عورت اور یہ بیوی! میری اندھی آنکھیں روشن میرا اجمڑا ہوا دل
گلشن کر دینے والی یہ حور یہ فرشتہ اور یہ بیوی! اس نے اس تنازع
دل کو جو تیرا گھر تھا از سر نو آباد کیا، اور اس نے کعبۃ اللہ کی بنیاد رکھی حج اکبر
کیا۔ یہ اب تیرے رحم کی مستحق اور کرم کی خواستگار ہے۔ اس کی دُعا
قبول، اس کی انتخاب منظور، فردوس اس کا دارِ جنت، اس کا گھر اس کی قبر
گھرا اس کا بیڑا پار۔

یہ تو مجھے یہاں آکر معلوم ہوا کہ آبا جان کی دعا نے چونکہ شوہر تھے
مُنہ سے نکلتے ہی درجہ قبولیت حاصل کیا، اور آبا جان کو حج کا ثواب عطا
ہوا۔ لیکن وہاں میں نے یہ دیکھا، کہ آبا جان کی زندگی سبب بیویوں کے لئے
ایک سبق تھی۔ جس وقت آبا جان نے دعا ختم کی اور آبا وار بلب۔ کہا کہ
بیویاں دکھیں کہ اس طرح عورت احکام اسلام کی تعمیل کر کے دنیا
کو باغ اور زندگی کو پھول بنا دیتی ہے۔ میرا دل شاید ہے۔ اور میرا

مذہب ثبوت کہ خدا اس سے راضی، رسول اس سے خوش، اس وقت ہر عورت جو وہاں موجود تھی تعجب سے دیکھ رہی تھی اور حیرت سے سن رہی تھی۔ بیویوں نے عہد کیا۔ لڑکیوں نے قسمیں کھائیں کہ وہ اسی طرح سے شوہروں کی اطاعت سے خدا کی مقدس مرضی حاصل کریں گی۔ اور دین و دنیا دونوں میں خوش رہیں گی۔

اس واقعہ کا چوتھا روز تھا کہ میرا نکاح ٹھیرا، دونوں میاں بیوی، اما جان اور بابا جان اس خیال سے نہال نہال تھے، کہ ایک بہت بڑے فرض سے سبکدوش ہوتے ہیں، لیکن بابا جان کے ابتدائی خیالات جو میرے دل پر جم چکے تھے ہر وقت میرے گلے کا ہار تھے۔ صحبت بھی روشن خیال لڑکیوں کی تھی اور مطالعہ میں بھی ازادی نسواں اور حقوق نسواں کی کتابیں اور اخبارات تھے۔ تعجب تھا کہ آج سنیہ معتمد ہے کیا۔ نکاح میرا، واسطہ میرا، شادی میری اور کر رہے ہیں، اما باوا، مجھ سے صلاح نہ مشورہ، ذکر نہ مذکور۔ خیر یہ بحث آپ کے سوال سے متعلق نہیں جانے دیجئے۔ میری شادی ہو گئی اور ایک ہزار نفٹ بجائے کاٹ کاٹ اور برتن بھانڈے کے بابا جان نے میرے نام جمع کر رسید حوالے کی اور رخصت کیا، میرا شوہر ایک نام تجربہ کار لڑکا اور غریب طالب علم تھا، اس کو صرف پانچ روپے ماہوار والدین دیتے تھے۔ ان کی پہلی غلطی تو یہ تھی کہ تعلیم ختم کئے بغیر نکاح کیا۔ اور دوسری یہ کہ اس آمدنی پر جو خود اس ہی کی ذات کو ناکافی تھی میرا بار بھی ڈال دیا، نئی نئی شادی وہ دولہا میں دلہن۔ وہ اولاد میں دونوں دل مار کر بیٹھ گئے مگر اس کے بعد میری سچہ میں اس کی یہ تدبیر آگئی کہ نقد روپیہ آخر کس کام کا ہے، ہم زندہ ہیں تو سسینکڑوں کمائیں گے اور اٹھائیں گے اور جب ہم ہی

دُکھ سہہ اور تکلیف بھگت چل بسے وہ ہزار کس کام کے، میرا شوہر جمیل افسوس یہ کہ بالکل چھپوڑا لڑکا تھا۔ اس کی باتیں ترکیبیں، مشورے، صلاحیں، کھلی ہوئی خود غرضی اور چالاکी و عیاری تھیں، مگر افسوس میں باوجود انا جان کی فحاشی اور باوا جان کے سمجھانے کے خاک نہ سمجھ سکی اس نے ایک دو ہی ہینے میں دیور بیچ باج الگ کیا، لاکھ اما ابا نے منع کیا، مگر میری آنکھوں پر کچھ ایسے پردے پڑے کچھ نہ سمجھائی دیا، یہ مرحلہ معمولی نہیں بڑی ٹیٹھی کھیر ہے۔ اسلام کا حکم عورت کے واسطے صاف ہے، لیکن ظلم ہوگا، اگر میں کہوں کہ میری وہ حالت خدا اور اُس کے رسول کے احکام کی تعمیل تھی، ایمان کی تو یہ ہے کہ ابا جان کے ابتداءئی خیالات کا اثر مجھ پر نہ ہوتا، اور میں آزاد منش عورت نہ ہوتی تو ہرگز اس کے پھندے میں نہ پھنسنی۔ خدا اور رسول کے احکام کا یہ منشا نہ تھا کہ میں ما باپ سے فرٹ ہو جاؤں ظالم نے دشمن کر دیا، ان عسریوں کی دی ہوئی چیز میں انکار کی وجہ روکنے کا سبب۔ روپیہ دیدیا اور ایک چار ہینے وہ گلچترے اڑائے کہ واہ واہ دن عید۔ اور رات شب برات تھی، ہزار روپیہ ہزار اشرفیاں نہ تھیں بہتری ہو گئے، روپیہ نہ رہا، مگر اس سلسلہ میں جو باتیں پیش آئیں وہ باقی رہ گئیں۔ اس تمام معاملہ کے ذمہ دار میرے ساس سُسرے ہیں، جنہوں نے اپنے بیٹے کا گھر آباد کرنے کے واسطے تین زندہ رو عین خاک میں ملا دیں۔ وہ اپنے لڑکے کے حالات و عادات سے اچھی طرح واقف تھے وہ اپنی مالیت اور لڑکے کی طبیعت کو خوب سمجھتے تھے۔ انہوں نے مکر کیا، فریب کیا، دھوکا دیا ایک کی شادی دو سکر کی بربادی کی۔ اس اس قسم کی شادیوں میں ما باپ بیٹے اور بہو دونوں کے سر پرانکس

ہوتے ہیں یہاں یہ بھی نہ تھا، وہ میرے ہی کیا اپنے ما باپ کو جوتی پر مارتا تھا۔ اما باوا میری صورت کو ترستے، میری آواز کو پھڑکتے، مگر مجھے اُن کے ہاں نہ جانا اور بات کرنا قسم تھا، ان کی مانتا تھی کئی دفعہ مجھے بلایا میری نالائقی تھی، کہ ایک دفعہ نہ گئی۔ شوہر انیس برس کا ٹیلا عقل یا تمیز رکھتا ہی کیا خاک تھا، ابا جان کی ابتداءنی شفقت کا نمونہ برقع اور پردہ سب کو آگ لگائی، دن بھر مزے سے سیریں کرتی اور رات بھر اطمینان سے تماشوں میں رہتی۔ یہ خبریں ابا جان کے کان تک پہنچیں اور شہر بھر کی انگلیاں ان کی طرف اٹھنے لگیں، عورت دار آدمی، بڑھاپے کا زمانہ، گھر میں جاتے اور پتوں کی طرح ڈاڑھیں مار مار کر روتے اور کہتے ہائے میری ناک کٹ گئی، کم نجت نے باپ دادا کی عورت خاک میں ملا دی۔

یہی نہیں کہ میری خبریں اُن تک جاتیں بلکہ اُن کی بھی میرے پاس آتیں، وہ روتے ہیں ہنستی۔ وہ چہنیں مارتے میں قہقہے لگاتی۔ ایک دن کا ذکر ہے میں شام کے وقت خاموش بیٹھی تھی، گنیشی آئی جو میرے ہاں اکثر آیا کرتی تھی ایک پردہ مسہری کا لیکر آئی اور کہا "آپ لے لیجئے پردہ کیا ایک جا دو تھا کہ میں دیکھتے ہی پھر ک گئی اور جب اس سے قیمت پوچھی اور اس نے سو روپے کے مال کے دس ہکے تو ایک کہی نہ دو چپکے سے روپیہ نکال حوالے کئے۔ اور پردہ مسہری پر ڈال باغ باغ ہو گئی، پردہ چوری کا تھا، میری خوشی ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ گھر کی تلاشی شروع ہوئی اور پولیس وہ پردہ لے مجھ کو ڈولی میں بٹھا شوہر صاحب کے ساتھ تھانہ پہنچی۔

مجھے خسر صاحب کی ہمدردی کا حال تو بیٹھتے ہی معلوم ہو گیا، جب

انہوں نے کہا۔ بہارا کیا ہے، بیٹی تو ہے نہیں بہو ہے، رکھی تو اس
سُروں کی اور کاٹی تو آتا باوا کی، رہا شوہر اس کا چال تھا، کہ میری
وجہ سے نہیں۔ اپنی تکلیف کی وجہ سے گھر میں اور سُرک پر، تھانہ میں اور
کو توالی میں برابر ہزاروں فضیحتیاں کر رہا تھا۔ کچھ روپے کا لالچ،
کچھ میرے خسر صاحب کی کوشش، رات کے دس بجے ہوں گے کہ
پولیس نے شوہر کو صبح حاضر ہونے کے وعدے پر رہا کر دیا، اور مجھ کو
ڈولی سے باہر نکل کر حوالات جانے کا حکم دیا۔ دیکھئے اس وقت بھی اس
بیان سے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُتری کہا رڈولی لے
چلتے ہوئے برق میرے سر پر تھا، ڈوپٹہ اوڑھے تھر تھر کانپ رہی
تھی، اور چاند کی روشن آنکھیں میرا تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ میں نے سامنے سے
ایک بڑھے کو آتے دیکھا، اس کی کمر جھکی ہوئی تھی کٹری ٹیکتا آیا اور خاموش
کھڑا ہو گیا، اس کے چہرے پر نقاب تھی ہاتھ پاؤں لہڑے تھے اور
منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ تھانہ دار نے میری طرف دیکھ کر سختی سے کہا
”لے جاؤ حوالات میں“ اور اس سے گھرک کر پوچھا ”کون ہے تو“ میں نے
دیکھا، کہ اب اس کے بدن میں عشر تھا، وہ آگے بڑھا اور کانپتے ہوئے
ہاتھوں سے ایک پرچہ تھانہ دار کو دیا، چاند پورا تھا۔ تھانہ دار نے
ہنس کر آواز سے پڑھا۔

شرافت کسی خاندان یا ذات کا نام نہیں، ذلت اور بے عزت انسان
کے اپنے اعمال ہیں، میرا یہ کہنا، کہ بھیب عورت جو اس وقت حرا
میں ہے شریف ہے یقیناً فریب ہوگا مگر میرا یہ کہنا بلا شک صحیح ہے کہ یہ اس
دادا کی پوتی ہے جس نے دس برس کی لڑکی کو دہلیز لاگنے پر زندہ دفن

کر دیا اور اس مائی بیٹی جس کا آنچل اس وقت تک بغیر مردنے نہ دیکھا
وقت کا سلوک ہے جو آج اس کو قیدی بنا کر اس سرزمین پر گھسیٹ لایا
میں اس کے بغیب دادا کا جس کی روح اس وقت غیرت سے لرز
رہی ہوگی، نمک حلال غلام ہوں۔ تھانہ دار صاحب اس سے
زیادہ نازک وقت آپ کی آنکھیں شکل سے دیکھیں گی کہ زادی خبط
اور قتل کا پھیر اس عورت کے جس کے بزرگوں کے بکتے ابھی دیر تان
میں زندہ ہیں پردہ سے نکال کر حوالات میں لے آئے یہ رحم کا وقت
اور عنایت کی گھڑی ہے اور اس سبب کی شرح جس نے جان دی
اور نواب سراج الدولہ کی بیٹی نہ تھی، میری سہیئت میں آپ سے لائق
جوڑ کر اعانت کی ملتی ہے۔ یہ عادی چور اور جرائم پیشہ اقوام سے
نہیں اس کا بڈھا اور بد نصیب باپ اور ما دیواروں سے سر بھوٹ
رہے ہیں، اگر آپ اس وقت رحم سے کام لیں گے تو میں اس کے
سوا اور کیا کہوں کہ خدا آپ پر رحم کرے گا۔

”تھانہ دار نے اس پر چہ کو پڑھ کر اس شخص کو اپنے پاس بلا لیا اور
آہستہ آہستہ کچھ باتیں کرنے لگا۔ بعد میں مجھ سے کہا۔ جا اس شخص
کے ساتھ چلی جا“

میں باہر آئی ڈولی نہ تھی مگر میرا شوہر باہر موجود تھا اور سامنے مامتا کی
ماری ماہر قہ اوڑھے کھڑی تھیں، مجھے دیکھ کر کچھ تو اس لئے کہیں
اتنے عرصے کی چھوٹی ہوئی تھی اور کچھ اس مصیبت کے اثر سے وہ
بلبل لگیں اور دوڑ کر لپٹیں، ان کی پیچکی بندھی ہوئی تھی مگر مجھ پر سوا
اس کے کہ جو سرمد توں ان کے سینہ اور کلیجہ سے چپٹا رہا اس وقت بھی

لپٹا ہوا تھا، اور کوئی اثر نہ تھا، انھوں نے اسی حالت میں مجھ سے کہا ”چل بد نصیب اب گھر چل“ اس کے ساتھ ہی شوہر نے کہا، ”میری عزت خاک میں ملی، میری آبرو برباد ہوئی، تمہارے ساتھ چلنا کیسا میں لیجاؤ لگا“

”اما جان۔“ میاں بے شک تمہاری آبرو برباد ہوئی اس کا علاج کیا جائیگا کہ آست رہا ایسا نہ ہو، تم بھی چلو تم کو کون منع کرتا ہے۔“

شوہر ”معاف کیجئے خدا مجھ کو آپ کی دہلیز پر نہ لے جائے۔ آپ نے سو بیہ ہضم کرنے میں کیا کسر کی تھی، جیسی مانی ویسی جانی۔“

اتنا کہہ کر شوہر نے اما جان کو جھٹک میرا ہاتھ پکڑا۔ اب وہ شخص آگے بڑھ کر میرے قدیموں پر گر پڑا اور کہا ”خدا کے واسطے رحم کر“ ہائے کس طرح کہوں۔ وہ میرا بد نصیب باپ تھا۔ جس کا سر میں نے قریب قریب اسی طرح ٹھکرایا۔ کہہ کر اہمیت سے اپنے پاؤں ہٹا لئے۔ انھوں نے نہایت حسرت سے کہا ”مجھ کم بخت باپ کی اس سفید ڈاڑھی پر رحم کر تو اُس ماکہ بیٹی ہے جس کا ثانی اس وقت روئے زمین پر نہیں“ مگر افسوس میرے کان پر جوں نہ چلی اور شوہر کے ساتھ آگے بڑھی، صبح کے وقت اس مکان کے مال متاع چھین چھان مجھ کو گھر سے باہر نکال دیا، اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں میکے آئی، گھر میں تدم رکھتے ہی جو سماں میری آنکھوں نے دیکھا وہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے، اما جان کا سر اما جان کی گود میں تھا اما جان کی آنکھ سے آنسو جاری تھے۔ اور اما جان کی آنکھیں بند تھیں، وہ اُن کا آخری وقت تھا، رات کے صدمے اور میری بے وفائی نے جان لے کر ان کا بچھپا چھوڑا میں گھر میں پہنچی تو اما جان نے گھبرا کر کہا۔ ”لو دیکھو ننھی آگئی“ انھوں نے آنکھ کھولی، حسرت سے آنسو کولیوں میں آئے

ہاتھیں کھلیں، مگر یہ خوشی آگ پر تیل تھا، اُن کی آنکھیں میرے چہرے پر رہیں اور روح پرواز کر گئی۔

اسی گناہ کی سزا میرے واسطے دوزخ ہے مگر میرا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر مسلمانوں کی قوم اپنے سچے مذہب سے اس قدر بیگانہ نہ ہوتی تو مجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا، ابابجان کے ابتدائی خیالات کا اثر مجھ پر اگر نہ پڑتا، تو میں کیوں آزادی کی شہید ہوتی۔ میرے ساس سسر اگر بیٹے کی شادی کے وقت اپنے فرائض کو محسوس کرتے اور سمجھتے کہ پرانی لڑکی کا لانا ماکا دودہ نہیں، ٹیڑھی کھیر ہے تو میرا یہ حشر نہ ہوتا۔

یہ تو میری داستان ہے، اب آپ کو میں وہ واقعات سناؤں جس نے مجھ کو اس اذیت میں راحت پہنچائی۔ میری اُستانی مس صاحبہ نے ایک روز فرمایا کہ ہم کسی کے مذہب کو بُرا کہنا جائز نہیں سمجھتے۔ جو جس مذہب میں ہے اس کے واسطے ہی اچھا ہے۔ لیکن اسلام نے ایک مرد کو چار نکاح کی اجازت دیکر جو سلوک عورت کے ساتھ کیا وہ بہت ہی تعجب خیز ہے مس صاحبہ کا یہ ارشاد میرے دل پر ہتھیر کی لکیر ہو گیا، اور میں سمجھی کہ یقیناً اسلام نے زیادتی کی اور عورت پر اس سے زیادہ ظلم نہیں ہو سکتا یقیناً نے مجھ کو ایسا برا لگ بخت کیا کہ میری نیت اسلام سے ڈانواں ڈول ہو گئی۔ واقعات پھر ایسے پیش آئے کہ یہ یقین روز بروز بجھتا ہوتا گیا اور دل عیسائیت کی طرف مائل ہوا۔ ایک دن جاڑوں کے موسم میں رات کے وقت سونے کے واسطے لیٹی مگر نیند کسی طرح نہ آئی، ادھر ادھر کی کتابیں دیکھنی شروع کیں ایک کتاب پیغمبر اسلام صلعم کے حالات میں تھی اس کتاب کے پڑھنے سے سب

سے پہلا خیال جو میرے دل میں پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ ہم عورتیں کثرت ازدواج کو ظلم سمجھ رہی ہیں، لیکن جن پر خود گزری اُنھوں نے اس ظلم کو خوشی خاطر کیوں برداشت کیا؟ اُہمات المؤمنین، یعنی رسول اللہ کی بیویاں اچھی طرح واقف تھیں، کہ سو کنیں موجود ہیں۔ پھر وہ نکاح پر کیوں رضا مند ہوئیں اور پھر یہ دیکھنے کی بات ہے کہ عائشہ صدیقہؓ کے سوا کنواری نہیں، مجبور و معذور نہیں، اُنھوں نے جو سو کنوں پر جاننا پسند کیا، تو آخر کوئی توجہ تھی اور وہ وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ خرافے کے پیچھے رسول تھے اور ہم میں سے جب کوئی شادی کا قصد کرتا ہے تو فقیر بھی اچھا بھرا پیرا گھر دیکھتا ہے وہاں فاقوں کے سوا اور کیا تھا، اور پھر چھپے ڈپکے نہیں چاند کی طرح روشن۔ مزایہ ہے کہ فاقے کی شکایت کرتی ہیں تو رسول اللہؐ ناخوش ہوتے ہیں۔ کیا اس کا علم کسی کو نہ تھا سب کو تھا اور اتنا تھا اور ایسا تھا۔ کہ آج ہم تک کو ہے، پھر جو سو کنوں پر اُن بیویوں نے اور ان کے وارثوں نے نکاح منظور کئے تو نبوت کے برحق ہونے کے سوا اور کیا سبب ہو سکتا ہے۔ اور لیجئے عورتیں بھی معمولی نہیں چوٹی کے خاندان اور شہر کی ناک آخروہ انسان نہیں تو کیا حور اور فرشتہ تھیں، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہماری طرح بشر تھے تو بیویوں میں وہ جذبہ کیوں نہ تھا ضرور تھا، مگر رسول اللہؐ کے نکاح کی عزت اس جذبہ پر غالب تھی، یہی وجہ صداقت رسالت کی کافی اور اکمل ہے۔ اس وقت اسلام کی عظمت میرے دل میں بیٹھنی شروع ہوئی۔ جوں جوں آگے بڑھی کتاب کا ہر ورق اور پاک زندگی کا ہر واقعہ ایسا تھا کہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔ ان تکالیف و مصائب کی برداشت جو اُس ذات پاک پر

پڑیں انسان کے اختیار سے قطعاً باہر تھیں۔ میں لرز گئی جب میں نے پڑھا کہ ان کانٹوں سے جو دشمنوں نے راستہ میں بچھا دیئے ہیں، ان پتھروں سے جو ظالم برسا رہے ہیں چہرہ اقدس اور پائے مبارک ہو لہان میں، ایک متفقہ جماعت کہتی ہے کہ اگر شادی کو کہو تو خوبصورت سے خوبصورت شریف سے، امیر سے امیر عورت حاضر کریں۔ دولت کو کہو تو سونا چاندی دام درم جس قدر کہو اور جس طرح کہو ابھی پیش کریں اسلام کا نام نہ لو لیکن خلیفہ واحد کے سچے رسول کی پاک طبیعت اس لالچ کو ٹھکرا دیتی ہے اور سنگ دل خانہ کعبہ میں اپنی چادروں سے گلا گھونٹتے ہیں آسمان اور زمین دونوں دیکھتے ہیں کہ آمنہ لال کی آنکھیں نکل پڑیں، اور قریب ہے کہ روح جسم مبارک سے علیحدہ ہو جائے کہ ایک انسان صدیق آگے بڑھ کر ظالموں کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور کہتا ہے ”ایک بے گناہ مظلوم کو صرف اس لئے مارے ڈالتے ہو کہ وہ راہِ راست پر بلاتا ہے!“ ایک یہ کیا ایسے ایسے اور اس سے بڑھ کر مظالم دن رات ٹوٹے مگر صداقت کے سامنے ہجرت تھے دولت کی ترغیب، حکومت کا لالچ، شادی کا وعدہ ایک طرف اور تکالیف و مصائب کا یہ پہاڑ ایک طرف، دنیا اس سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی چلتی رہی اور چل رہی ہے۔ لاکھوں کڑوڑوں مائی کے لال پیدا اور ناپید ہوئے رشی بھی اور منی بھی، حواری بھی اور راہب بھی، نبی بھی اور پیغمبر بھی مگر آغوشِ زمین میں نیم عبد اللہ جیسا بچہ کھیلا ہو تو تاریخ بتا دے؟ تعلقاتِ دنیا کو چھوڑ کر پہاڑ کے دامن میں بیٹھ کر کنارہ دریا پر رہ کر اللہ اللہ کرنا اور بات ہے، بیوی بچوں کے ساتھ دکھ میں اور مصیبت میں فاتے میں اور فقر میں عید بیت کی کسوٹی پر پونا اترنا اور چیز ہے، مصروف

شام کے دو عالم تو ریت کے ماہر انجیل کے واقف اس سپین گوئی کے منظر جو خدا کی مقدس کتابوں نے دی، پس منکر کہ خاک عرب سے اٹھنے والا رسولؐ ظہور کر چکا، شوق کی آنکھوں سے دیوانہ وار لپکے اور پہنچے۔ لگوں سے دوکانداروں سے دریافت کیا۔ چاروں طرف ڈھونڈتے پھر رہے تھے، کہ سامنے سے آدمیوں کا غول آتا دکھائی دیا۔ چاروں طرف لوگ بیچ میں ایک سیاہ کملی والا مار تے پیٹتے چلے آ رہے ہیں۔ چہرہ اُلوہاں ہے۔ پیشانی سے خون بہہ رہا ہے قدرت اگر طاقت رکھتی ہے خدا میں اگر واقعی کوئی قوت ہے تو اس سے زیادہ جلال کا وقت کونسا ہوگا، کہ اس کا سچا رسول اس طرح ذبح ہو رہا ہے۔ ایک دوکاندار دونوں سے کہتا ہے۔ ”محسّس یہ ہے“ دونوں آگے بڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس حالت میں بھی رسولؐ ہاشمی نے چہرہ اقدس کا خون ہاتھوں سے پونچھا، آسمان کی طرف دیکھا اور اس ڈر سے کہ کہیں خدا کا غضب ان لوگوں پر نہ نازل ہو جائے، گرگڑا کر کہا۔ ”آہی میری قوم کو موات کی بجائو اس نے مجھے پہچانا نہیں!“

ان واقعات کا مجھ پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور دل نے بیباختہ صدا دی کہ اسلام دین برحق ہے۔ میرے دل پر کچھ ایسی چوٹ لگی کہ میں گھنٹوں روتی رہی۔ کتاب رکھ دی پچھلے دل سے درود شریف پڑھا، اس روز سے یہ معمول رکھا، کہ روزِ حرّہ رات کو سوتے وقت درود شریف کا ورد کرتی اور اسی میں سو جاتی۔ یہ اُسی کا طفیل ہے کہ اس عذاب میں ثواب بھی میسر ہے اور اذیت میں راحت مل جاتی ہے ہاں یہ عقیدہ یہاں آکر کھل گیا، کہ جب تک عورت دنیوی منہ لٹھ نہ ادا

کرے محض دین ذریعہ نجات نہیں ہو سکتا۔

(۱۱)

نستون کے بچے کی صحت حیرت، تعجب، اچنبھا، سب کچھ ہی تھا کہ ما اور باپ ہی نہیں حکیم اور ڈاکٹر تک مایوس ہو چکے تھے، کچھ خدا ہی کا فضل تھا کہ بچہ موت کے منہ سے بچا، ورنہ اسیدیں تو سب ہی ٹوٹ چکے تھیں عادت اور نستون اس صحت پر جس قدر نہال نہال ہوتے بچا تھا۔ ماکا مانتا باپ کی محبت مگر صحت سے بیدر ہوا زیادہ تعجب انگیز امر یہ تھا کہ معصوم کی صحت پر سارا محالہ باغ باغ تھا اور یہ صرف نستون کے تعلقات تھے کہ بڑھا اور جوان ہر متنفس اس کا شہر مندہ احسان تھا۔ بیمار کے ساتھ باپ کی اُلفت اور ماکا کی لگی ہی نہیں سینکڑوں مریضوں اور اپا بچوں کی دعائیں تھیں، بچہ عادت کا بیمار تھا، اور مسجد میں سجدے محلہ والوں کے دم پر نستون کے بن رہی تھی۔ اور صحت کی التجائیں یتیم اور رانڈوں کی تھیں تندرستی کے بعد ایک یا دو، دو چار نہیں بیسیوں بڑھیاں ٹھہریاں اور کیسی کھو نشتر جوتی، لبسیری دوپٹہ آ رہی ہیں۔ اور کہہ رہی ہیں کہ ”بیوی اللہ تیری مانتا ٹھنڈی رکھے۔ ساری ساری رات دعائیں مانگی ہیں نترن سن رہی ہے، اور شکریہ ادا کر رہی ہے، ایک البتہ وسیلہ دلہن کو مبارک باد تو کیا اظہار مسرت بھی کرنا نصیب نہ ہوا، ورنہ چھوٹے سے بڑے تک کسبہ برادری محلہ پڑوس سب ہی خوش تھے، بہ ظاہر بچہ کی صحت کم دعاؤں کی کثرت زیادہ اور دسیم دلہن کی خاموشی اور بھی زیادہ تعجب انگیز ہے، اولاد والی، مانتا سے اچھی طرح واقف اور واقف کیسی وہ بد نصیب ماجو ایک زندہ شیر سو تیا ڈاہ کی قبر میں ہمیشہ کی نیند

سلا چکی، لیکن، امڈرے سنگ ولی ٹس سے مس نہ ہوئی، انگاروں پر لوٹ رہی تھی کہ میرا بچہ اچھا بچھا کالے پانی پہنچے اور اس کا مردہ زندہ ہو جائے، لیکن تینوں تعجب پہلا دوسرا اور تیسرا حالات کے اعتبار سے بے وقعت ہو جاتے ہیں، سنترن خدا کے بندوں کے ساتھ تھی، بندوں کا خدا اس کے ساتھ تھا، اس کی محبت اور خلوص نے جو دل فتح کر لئے آج اُن سب سے اس کے واسطے دعائیں نکل رہی تھیں، رہی وسیم دھن وہ اس طبیعت اور طینت کی عورت نہ ہوتی تو یہ دن ہی کیوں دیکھتی۔ یہ صبح سوتیا ڈاھ کی آگ نے جگر بھون اور کلیجہ بھلس دیا تھا، لیکن سو کن تو سنترن تھی بے گناہ اور معصوم بچوں نے کیا بکاڑا تھا کہ انکی بھی دشمن بنی؟

اسلام کی مفارقت ابدی نے جو زخم وسیم دھن کے کلیجہ میں ڈالا سنترن کی کامیابی اس زخم میں کچھ کے تھے، اول تو بچہ ہی کا خیال کسی وقت پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ اور گھڑی آدھ گھڑی کو اگر علیحدہ بھی ہوتی تھی تو سنترن کا طمینان وہ بلائے بے درماں تھا کہ کسی کر دٹ اور پہلو چین ہی نہ دیتا تھا، یہ وہ فتن تھا کہ تعلیم یافتہ خواتین زیور کی مخالفت زور شور سے کر رہی تھیں اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ زیور کا استعمال ایک قسم کا عیب سمجھا جاتا تھا۔ لیکن حقیقت میں یہ خیال اس کوئے کی تقلید تھی جو ہنس کی چال چلا، اور جس کا منشا یہ تھا کہ شوہر کے بعد جو ہزار دو ہزار روپیہ زیور کی صورت میں بچ رہتا تھا بیوہ عورتیں اس سے محروم ہو جائیں لیکن سنترن اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ تھی۔ جڑاؤ گلو بند اس کے پاس ایک چھوڑ دو دو موجود تھے، مگر پھر بھی اس کا یہ مقولہ تھا کہ زیور رے کا سنگھار اور بھوکے کا ادھار ہے، عید کے موقع پر عادت کسی ضرورت

سے جوہری کی دوکان پر گیا، تو گلوبند اور کنگن ایسے دیکھے کہ پھٹک گیا، دونوں کا مول کر گھرایا، اور سنتوں کو دیتے گو گھر کا تمام انتظام کھانا پینا وغیرہ سب سنتوں کے اہتمام سے تھا، مگر وہ ہمیشہ اس بات کی احتیاط کرتی تھی، کہ جو حقوق دسیم دھن کو شروع اسلام نے عطا کئے ہیں وہ زائل نہ ہونے پائیں۔ قیمت دونوں کی قریب قریب برابر تھی، اس نے گلوبند خود پہنا اور کنگن شوہر کو دیکر کہا: "یہ بسم اللہ کر کے دھن پہنی ہوئی کو پہنا دیجئے۔" سنتوں کی اس احتیاط کو شروع میں تو عادت نے پسند نہ کیا، مگر جب اسے یقین ہو گیا، کہ یہ ناپسندیدگی فضول تو خود بھی اس رستہ پر پڑ گیا دسیم دھن کے زیور کا بڑا حصہ الفتوں کی نذر ہو چکا تھا، اور اب اس کو زیور کی پروا نہ تھی، مگر نہ معلوم کیا نیکی کے دم میں تھی، کہ ڈبیا لے لی اور خاموش ہو گئی۔ عادت چلا گیا، تو ڈبیہ کھولی، کنگن نکالے تو ایک پر سونے سے یہ حرف کندہ تھے،

زن بن بدزن (بدظن) نہ بن" دیکھا، پڑھا اور رکھ دیا یہ توقع کہ وسیعہ دھن کنگنوں سے خوش ہو جاتی جائز نہیں اسلام کا فراق سنتوں کی ترقی یہ دو مرض ایسے چھپے گئے تھے کہ نیند کے چند گھنٹوں میں تو شاید دماغ چھٹکا رہا جاتا ہو، ورنہ ہر لمحہ ایک سے ایک زیادہ سر پر ہوا تھا۔ بد بخت وہ بن بھی پر لے سرے کی تھی۔ اس موقع پر آنے جانیاں برابر کی میٹھے والیاں خوب ہاتھ رنگ رہی تھیں۔ دل سے جوڑ کر ہاں میں ہاں کرتیں۔ باتیں ملاتیں۔ اور کام بناتیں۔ جائداد کا کرایہ جو بچوں کی امانت تھا۔ اسی کے ہاتھ میں آتا اور خوشامدیوں کی بھینٹ چڑھتا۔ کچھ اپنے دم کی وجہ سے کچھ سیمیلیوں کی کوشش سے یہ تو اسے یقین تھا کہ اسلام کو

سزا صرف عادت اور نسنترن کے سبب سے ہوئی، ان دونوں نے میرے بے گناہ بچہ کو مجھ سے چھٹوایا۔ اس یقین کے ساتھ ہی وہ ہمیشہ اس کوشش میں مصروف رہتی کہ بدلا لوں پورا لوں اور ایسا لوں کہ دونوں میاں بیوی کلیجہ مسوس کر رہ جائیں۔ یہ ضبط کچھ ایسا ہاتھ دھوکہ کچھ پڑا کہ عادت اور نسنترن کے ہر کام میں اُس کو اسی کی جھلک نظر آتی۔ عادت نے کوئی کاغذ پڑھنا شروع کیا اور وہ سمجھی اسلام کا خط ہے۔ مجھ سے یہ چھپاتے ہیں۔ عادت نے کوئی بات کی اور اس نے سوچا کہ میرا ذکر ہے، ایک سو کن موجود تھی مگر وہم یہ ہی تھا کہ دوسری آئی، حنہ بھلا کرے اینیوں غنیوں کا ایک ادھر سے آئی اور کہہ دیا ”میاں اسلام کا خط آیا ہے، اسی درزن کو سنا رہے ہیں“ دوسری ادھر سے آئی اور کہا ”جوڑے چڑھاوے کا حساب کر رہے تھے، اور نکاح کرتے ہیں“ تیسری کچھ اور چوتھی کچھ اور غرض وہم کا کوئی ٹھکانا اور بدگمانی کی حد نہ تھی۔ ہر نصیب کو میاں کی محبت بھی عداوت دکھائی دیتی تھی اور چاہتی تھی کہ میری طرح عادت اور نسنترن دونوں مصیبت کا شکار ہوں، نسنترن کے اصرار سے بھی اور خدا کے خوف سے بھی عادت ایک وقت کا کھانا کشر و سیم دھن کے کمرہ میں کھانا مگر کمرہ کی یہ کیفیت کہ بازار اس سے بہتر تھا، ایک پھوہڑ عورت کے گھر میں جو جو کچھ ہونا چاہئے سب موجود تھا۔ درمی خاک میں آئی ہوئی اور چاندنی چکتوں سے لپی ہوئی۔ بیٹھنے کی جگہ نہ لیٹنے کا مقام غریب نے اگر بھولے بسرے پانی منگا لیا تو گلاس کس کا اور صراحی کیسی۔ اور بیوی پانی پلاوے تو کیوں۔ سلیم نے کچھڑ کی صورت منگے میں آنسو را پھرا حوالہ کیا اور چلتا ہوا۔ برخلاف اس کے نسنترن کا کمرہ عادت

کے اجلاس کو مات کرتا تھا، جہاں سے اٹھنے کو آدمی کا جی نہ چاہے عادت کو مائل کرنے کے واسطے نترن کی صورت ہی نہیں اس کا سلیقہ اور خدمت بھی تھی۔ وسیع دُھن کم بخت کی تو کچھ ایسی مت پٹی تھی کہ دن رات اسی کوشش میں غرق اور جلتوانی میں غرقاب تھی کسی بات کا نہ کر تھا نہ چیز کا ہوش۔ زیور کا صندوق کھلا رکھا تھا۔ سلیم کنگن لے اڑا، وسیع دُھن پر اگر مصیبت تھی تو شوہر اس کا ذمہ دار نہ تھا۔ کنگن اس کے پاس کہنے کو ملکیت ورنہ شوہر کی امانت تھے۔ اس کے صنائع کرنے کا حق نہ تھا۔ مگر اس بیچارے کو خبر بھی نہ ہوئی۔ محض سرکاری کام کی وجہ سے دو تین دن اور رات ادھر نہ آسکا، کہ ایک نے لگا دیا کہ کنگنوں کے سبب سے ناخوش ہیں اور گھر سے نکالنے کی فکر میں ہیں میرے سامنے دستوں کے بھانجے عائشہ کے لڑکے نے کنگنوں کا حال سرکار سے کہا اور میں تو جانوں اسی نے چرائے۔ نہیں تو اسے کہاں سے خبر ہوئی، وسیع دُھن کی بدگمانی اگر عادت کی ذات تک محدود رہتی تو بھی میاں اپنی تقدیر کو پھوڑتا بیوی اپنی، مگر وہ بد نصیب تو سب گنوں پوی تھی، ہم کو اس کی زندگی میں سب سے زیادہ تعجب انگیز معاملہ یہ ملتا ہے کہ ماں بنکر ماں منار کھکر صاحب اولاد ہو کر اس آگ کی قدر نہ کی، کائنات کی کوئی دولت اس حالت کی قیمت ادا نہیں کر سکتی، جب ایک ماں فرط محبت میں بچہ کو بھیج بھیج کر کلیجہ سے چٹا رہی ہو سہاں کا اندازہ صرف وہی انسانی ہستی کر سکتی ہے جو اس دولت سے مالا مال ہو، قادیق کے خون کا ہر قطرہ یہ حق رکھتا تھا، کہ سنگ دل اگر اپنا تمام خون بھی شربان کر دیتی تو اطمینان نہ ہوتا نہ یہ کہ بن ما اور بن باپ کا بچہ بے وارثا بچہ حفیظ

جس کو نستون چھ ہینے کی جان مردہ ما کے سینہ سے اٹھا کر لائی، کلیجہ سے نکلیا اور اس طرح پالا کہ حقیقی ماباپ معصوم دل سے ٹھلا دیئے، صرف اتنی خطا پر کہ خالہ کہہ دیا تھا ایسی سزا پائی کہ آسمان و زمین ٹھہرا اٹھے، یوں تو وہ ہر وقت ہی ایک ایک کو دیکھ کر بھٹی جاتی تھی، مگر جب سے یہ سنا تھا کہ اس حفیظ نے لنگن چرائے اور میاں سے لگائی، خون کی پیاسی تھی، جانتی تھی کہ نستون بچوں سے زیادہ بن ما کے بچوں کی عاشق ہے اس کے سامنے ہمت نہ پڑی وہ اتفاق سے کسی شادی میں گئی اور یہاں بچوں کو گھر میں چھوڑا، جس طرح بعض مکار انسانوں کو بلا ضرورت رونا آتا ہے اسی طرح نالائق عورت خود کشی پر بھی آمادہ ہو جاتی ہے۔

وسیم دھن اتنی با حیا تو تھی نہیں۔ ہاں بچپن کی سنی سنائی یہ یاد تھی کہ چوڑیاں اور شیشے بھی نہ ہر کا کام دیتا ہے، اگر خود کھا کر باپ دادا کی زوالت ثابت کر جاتی اور پردہ ڈھک جاتا تو بھی غنیمت تھا، نہ ہر دینے کا قصد کیا اس بے وارثے معصوم کو جس کے ما اور باپ دونوں کی قبریں تک برباد ہو چکی تھیں، تازہ حُرم یہ تھا، کہ بچہ چونکہ نستون کو خالہ کہنے کا عادی تھا گو اب یہ باتیں ختم ہو چکیں لیکن کسی زمانہ میں مسلمان یہ احتیاط کرتے تھے کہ ہمسایہ کو عزیزوں کے برابر سمجھیں، بخاریں پہلانا ووسیم دھن کے پاس آیا اور کہا خالہ جان سر میں درد بہت ہو رہا ہے پی باندھ دیجئے، یتیم بچہ جس کا والی نہ وارث ووسیم دھن کو خالہ! پہلے ہی صورت سے بیزار تھی اس وقت تو غصہ میں آگ ہو گئی اور کہا، درزن کے جننے بے ایمان ہم کو خالہ کہتا ہے اتنا کہہ کر ظالم نے معصوم کا کان پکڑ کر مڑوڑا اور اندر کو ٹھہری میں لے چلی، بچہ کی زبان خاموش تھی، مگر جس وقت اس نے کانپتی

ہوئی آنکھیں اس تلاش میں جفا کار کے چہرے پر ڈالی ہیں کہ طاقتور ہاتھ کیا کرنے والے ہیں، تو اس کا دل ہی نہیں اس کا جسم لرز لرز کر باواز بلند کہہ رہا تھا کہ ”باختیار بی بی بے اختیار بچہ پر رحم کر، قصائی بھولی گائے کو اندر لے گئی سامنے کھڑا کیا۔ اور جو شمیم دل اس توقع پر حاضر ہوا تھا کہ سخت درد میں پٹی بندھوا لے اس نے اپنے جسم پر سڑا سڑبیدوں کی آواز سنی۔ بلک گیا نہ ٹرپ اٹھا، ہاتھ جوڑے، قدموں میں گر مگر سزا اس وقت تک ختم نہ ہوئی جب تک بچہ یہ کہتا ہوا بے ہوش ہو کر نہ گرا ”خطا ہوئی معاف کیجئے“ مگر اندر سے بند تھا، اور دنیا کی کوئی طاقت ایسی نہ تھی کہ مکرور شمیم کو طاقتور وسیلہ دِلھن سے چھٹا دے وہ ہاتھ جس نے دسیم دِلھن جیسی سینکڑوں منڈیاں زمین پر گر ڈیں بچہ کی مدد کو آگے بڑھا اور اور ایک سیاہ بچہ کی پھدکا کر مکرور اور طاقتور دونوں کے کان میں آئی، بچہ کی ہر التجا، بی بی معاف کرو، بیگم اب نہیں،“ بیکار تھی دسیم دِلھن بچہ کو دیکھ کر ڈری، ہاتھ روکا، گٹھی کھولی، بچہ قریب آگیا تھا، چاہتی تھی کہ بھاگے کہ بچھوٹے پاؤں میں ڈنک مارا اور دسیم دِلھن بھی ہاتھ مر گئی، کہہ کر بچہ کے پہاڑ میں گری۔

(۱۲)

شعبان کی چودہ تاریخ کو غریب آفتاب کے بعد جب مسلمان ماؤں کی دی ہوئی قیمت سے بچے دھڑا دھڑا آتش بازی چھوڑ رہے تھے سب سے پہلے فرشتوں نے ان عورتوں پر لعنت کے نعرے بلند کئے اس کے بعد آفا نا جنت آراستہ کر دی گئی۔ آج جنیتوں کی عید تھی۔ کامیاب روحیں نہال نہال پھر رہی تھیں اور نور الہی کی تجلی کی منتظر تھیں، نسیم بھی دوسری روحوں کے ساتھ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی کہ اس کی نظر

ایک ایسے محل پر پڑی جہاں ایک حسین لڑکی طلحہ کی مسہری پر بیٹھی تھی۔ جو میں اور فرشتے جلو میں حاضر تھے۔ دودھ اور شہد کی ہنسی اس کے سامنے لہریں لے رہی تھیں اور اس کی بہار قصر نسیم کو مات کر رہی تھی۔ نسیم اشتیاق کے قدموں سے آگے بڑھی اور اندر داخل ہو کر سلام کیا جنتی بیوی نے دیکھا کہ نسیم بھی کامیابی کے زیوروں سے مزین ہے۔ استقبال کو اٹھی اور بغلیں گریہ مونی نسیم متحیر تھی کہ آخر اس بیوی کے اعمال کیسے ہوں گے کہ اس کا درجہ سب سے فائق ہے۔ لڑکی مسکرائی اور کہا "تعب نہ کیجئے مسلمان پیدا ہوئی مسلمان ہی، مسلمان مری، جنت ما باپ کے قدموں کے نیچے سمجھی، شوہر کو حنائے مجازی جانا، دنیا کو الخلق عیال اسٹر خیال کیا۔ یہ تین باتیں تھیں، جنہوں نے اس درجہ کو پہنچا دیا، کبھی سچ اور کدھر کے نوافل صرف فرض کی ادائیگی نے یہ رتبہ دیا۔ دنیا ایسی گذری کہ خدا ہر عورت کو دے، اور آخرت تم دیکھ ہی رہی ہو شوہر کی نہایت معقول آمدنی تھی۔ گھنٹہ پاتا۔ کپڑا۔ لٹہ نوکر چاکر کو بیٹھی۔ بنگلہ سب کچھ ہی موجود تھا، ما باپ غریب تو نہیں مگر متوسط الحیثیت تھے۔ ہم دو بہن بھائی تھے ابا جان کے بعد اما جان نے جس مصیبت اور وقت سے بچے کو جوان کیا ان ہی کا دل جانتا ہو گا۔ ایک دو نہیں تین تین چار چار وقت کے فائے کئے اور شوہر کی عزت میں فرق نہ آنے دیا۔ گھر میں چکٹ چادر لپیٹ کر بیٹھی اور بچہ کو دو لہا بنا کر باہر لکھا لا۔ صاحب ثروت بھائی اور کھاتی بیٹی بہن موجود تھی۔ مگر اٹھ لے غیرت، مٹھی بھر چنوں میں دو دو وقت تیسرے کئے۔ لیکن شوہر کے نام کو بڑے زنگنے دیا۔ زندہ دنیا ایسی بیویوں کی مثال کم پیش کرے گی، ابا جان کے

چار سو روپے مامو جان کے حساب میں تھے، مگر انھوں نے نہ دیئے اب جان کے بعد عید کے روز جب اما جان دس گھنٹے کی بھوک پیاسی چپہ کو پاس لئے بیٹھی تھیں، ماموں جان آئے۔ اللہ غنی کس شان کی عورت تھیں کمرے میں گئیں کپڑے بدلے باہر آئیں، کیا مجال جو لباس سے چہرہ سے گھر سے تکلیف اور مصیبت کا پتہ لگ جائے، مامو جان نے روپوں کی پوٹلی دی اور کہا ”یہ تمہارے میاں کے چار سو روپے ہیں“ اتنا سنتے ہی ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور رور کر کہا۔ روپیہ آپ کو مبارک جس کی ملکیت تھی جب وہی محسوس چلا گیا، تو اب میں لیکر اس کی روح کو صدمہ نہ پہنچاؤں گی۔ آپ خاطر جمع رکھئے مرنے والا اتنا چھوڑ گیا ہے کہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں۔“

اُن کی زندگی کا تمام سہارا اور دنیا کی تمام امیدیں میرا چھوٹا بھائی تھا۔ آدھی رات تک گھومتے رہتا تھا کہ مدرسہ کی فیس ادا کی۔ پانی کی ایک مشک اور چار آنے کے آٹے میں آٹھ دن بسر کئے۔ اور اس کو بی۔ اے تک پہنچایا

امتحان والے روز جس وقت انھوں نے چٹنی اور روٹی سامنے لا کر رکھی اور رو کر کہا۔ ”بیٹا بد نصیب ما کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں“ تو میرے آنسو بھی نکل پڑے۔ جس روز امتحان کا نتیجہ آیا، اور انھوں نے آکر کامیابی کی خبر سنائی۔ تو اما جان گلے سے لگا کر اس قدر روئیں کہ بچی بندھ گئی اُن کے ہاتھ بچے کے گلے میں تھے اور نگاہ آسمان پر رہ رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ ”تو نے اپنی قدرت کے کرشمے دکھا دیئے۔ میں اس لائق کہاں۔“

اسی حالت میں لشتم ہشتم اُنھوں نے بھائی کا گھر بسا دیا۔ خدا کی عنایت کہ اسی سال دو سو روپے کے نوکے ہو گئے۔ مگر ابھی ہمیں پورا نہ ہوا تھا کہ

طاعون میں گرفتار ہوئے، میں اما جان کا کیا حال بیان کروں۔ کلیجہ پر گھونسے مارتی تھیں، دیواروں سے سر پھوڑتی تھیں اور کہتی تھیں۔ ”ہائے جوان شیر! بڑھیا ما پر رسم کر، تیسری رات تھی اور گھر میں ہم تین کے سوا کوئی نہ تھا کہ اما جان بیمار اور بیہوش بچہ سے لپٹیں اور خدا سے التیٰ کی کہ اس کی موت نہ دیکھوں، روتی تھیں، بلبلائی تھیں، جھپٹی تھیں، کلیجہ پر گھونسے مارتی تھیں۔ دیواروں سے سر پھوڑتی تھیں۔ اس وقت بھائی جان نے آنکھ کھولی۔ اما جان کو اپنے پاس بلا لیا اور آہستہ سے کہا ”قربان ہو جاؤں اس صورت پر اے ماصیر کر“

اما جان نے ایک چنچ ماری اور اُن کی چنچ کے ساتھ کلیجہ کا ٹکڑا ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔ اس واقعہ کے پانچ سال بعد جب میں اما جان کے مرض الموت میں ان سے ملنے گئی تو آدھی رات کے وقت جب ان کا سر میری گود میں تھا، انھوں نے میری طرف دیکھا اور گڑ گڑا کر کہا۔ ایک درخواست کرتی ہوں، رانڈ بھاوج آنکھوں سے آنڈھی اور معصوم بھتیجا بن باب کا بچہ ہے اگر اجازت دو تو یہ مکان ان کو دیدوں۔

میں اما جان کے قدموں میں گری اور عرض کیا ”آپ کا مال ہے آپ مالک ہیں۔ میں لونڈی ہوں۔ میں نے اپنا حصہ معاف کیا“ اس وقت اُن کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور انھوں نے صرف اتنا کہا ”جس طرح اس آخر وقت میں تم نے مجھے خوش کیا ہے۔ خدا تم کو دین اور دنیا دونوں میں خوش رکھے“ یہ میری کامیابی کی ایک وجہ ہے۔ دوسری یہ کہ گو میرا شوہر ایک متبول رئیس تھا اور ڈیڑھ دو ہزار روپیہ کی آمدنی، مگر اس قدر فضول خرچ کہ دو کیا اگر دس ہزار ہوں تو صبح سے شام تک بلا برکے کچھ

وقت کا تقاضا تھا۔ کچھ صحبت کا اثر کہ اس کی طبیعت میں آوارگی پیدا ہوئی اور روپیہ بر باد کرنا شروع کیا۔ ایک تین سال کے عرصہ میں تمام علاقہ اور جائیداد ختم ہوئی۔ روپیہ پاس رہا نہیں ضرورتیں رہیں بدستور۔ زیور بکنا شروع ہوا اور اس لئے کہ میں منع کرتی تھی۔ مجھے میکے پہنچا دیا، مگر اس وقت جب کان میں چاندی کی بالی اور انگلی میں تابنے کی انگوٹھی تک نہ رہی، چند روز بعد وہ یار دوست بھی ایک ایک کر کے کھسکنے شروع ہوئے اور فوٹ یہاں تک پہنچی کہ واپس کر دینے کا تنکا تک نہ رہا۔ اور اس کے ساتھ ہی مگر میں ایک ایسا پھوڑا لکلا کجان کے لالے پڑ گئے، مجھ کو جس وقت یہ خبر پہنچی ہے کہ حالت یہ ہے کہ شاید آٹھ دس روز اور زندہ رہیں تو میری آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی ہزار روپیہ میرے پاس انکی کمائی کا محفوظ تھا۔ میں بے تابانہ ان کے پاس پہنچی تو کیا دیکھتی ہوں کہ میلے چمک چمکے کپڑے کھڑی چار پانی پیرا کیلے پڑے ہیں سجا روز و شور کا ہے، اور کروٹ تک نہیں لی جاتی۔ میری صورت دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے ”میرا قصور معاف کرو، آخر وقت ہے، تم سے سخت نادم ہوں، میں نے وہ ہاتھ اپنے سر پر رکھے اور کہا ”تم آقا اور مالک ہو، مجھے گنہگار نہ کرو“ ان کی طبیعت اور بھرائی اور کہا ”ایک ایک پیسہ کی دو اکو تیس رہا ہوں، یہ منہ اس قابل نہیں کہ تم کو دکھاؤں“

میں ان کے قدموں میں گر پڑی۔ رو رہی تھی، کہ اتنے میں چپ آدیموں کا غل غپاڑہ ہوا اور معلوم ہوا پانسو روپے کے قرضہ میں گرفتاری ہوگی وہ اس وقت بید کی طرح کانپنے لگے، میری طرف دیکھا اور کہا۔

”بیگم اب کیا کروں“

میں نے وہ روپیہ ان کے آگے ڈال دیا اور کہا ”گھبراؤ نہیں تمہاری کمائی میں سے ہزار روپیہ محفوظ ہے، قربان کیا تھا یہ روپیہ“ انہوں نے میری طرف دیکھا اور اچھیل پڑے۔ ہاتھ میرے سر پر رکھا اور کہا: ”شوہر نہیں غلام ہوں“

میں تو اس قابل نہیں، مگر خداس کا بدلہ تم کو دیاں دے گا۔ ان کی دعا قبول ہوئی، اور یہ اُن دونوں دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ میں اس دجہ کو پہنچی۔

(۱۳۳)

اُدھر یہ گزری ادھر سلیم شیشہ اور کاغذ ملا دودھ کا پیالہ جو سلیم دھن نے حفیظ کے واسطے رکھا تھا، منہ سے لگا غٹ غٹ پی گیا، اور تھوڑی دیر بعد کلیجہ کٹنا شروع ہوا، پہلی ہی اُبکائی میں آنکھیں پتھر آگئیں اور بیچ انگنائی میں بے ہوش ہو کر گرا۔

یہ وہ وقت تھا کہ ایک گھر میں تین بے ہوش پڑے تھے۔ بخار زدہ حفیظ۔ وسیم دُلہن۔ اور اس کا بچہ سلیم۔ حفیظ کا چوٹ سے سلیم کا زہر سے اور وسیم دُلہن کا بچھو سے، تینوں کا جسم نیلا چوڑی تھا۔ سب سے پہلے بیمار معصوم کی آنکھ کھلی مگر وسیم دُلہن کی ہیبت دل پر اس قدر چھا گئی تھی کہ اس کو برابر لیٹا دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے بعد وسیم دُلہن ہوشیار ہوئی تو نماز عشاء کے بعد دستون کی یہ دعا اس کے کان میں آئی۔

مولا کس کی طاقت؟ ایک خاک کا پتلا انسان، آقا کس کی ہمت ایک احسان منرا موش بے ایمان۔ تیری ابدی طاقت اور ازل کی حکومت

کے آگے فرٹ ہو، دین و دنیا کے مالک! تیرے ادنیٰ عتاب سے زمین و آسمان کے بادشاہ! تیرے معمولی عذاب سے شاہوں نے بھیک مانگی، سلطنتیں تاراج ہوئیں، حاکم حقیقی وہ عقل دیوانی وہ دماغ خبطی جو اپنی طاقت پر بھولے، جو اپنی حالت پر اٹھٹھے، شہنشاہ دو جہاں وہ طاقت فانی وہ حالت ناپائدار مستقل طاقت ابدی حکو مرت ارحم الراحمین تیری تیری تیری۔

ایک گنہگار سستی کو ایک نابکار عورت کو، ایک انسان فانی کو، ایک نافرمان مغلامی کو یہ درجہ یہ رتبہ، یہ عورت، یہ دولت، آزار سے دور افکار سے الگ، گھر بار کی مالک تحصیلدار کی بیوی، قربان ہو جاؤں، صدقہ ہو جاؤں، نثار ہوں، فدا ہوں، میرے مولا تیری عنایت کے تیرے رحم کے، تیری شفقت کے، تیرے کرم کے،

”نا فرمانی ہوں با باپ کی، احسان فراموش ہوں شمع ہر کی۔ گنہگار ہوں تیری، مگر آقا لرزتی ہوں، مولا کا بیتی ہوں، تیرے عذاب سے تیرے عتاب سے“

ابھی نساتوں و عایں مصروف تھی کہ ”ہائے ہائے کی“ آواز کان میں آئی گھبرا کر اٹھی کہ یہ منظر دیکھا۔ وسیع دھن کا بدن ایک پھوڑا تھا جس میں سر سے پاؤں تک پیپ اور لہو بھرا ہوا تھا۔ چپکیں اور شیشیں اس غضب کی تھیں کہ ایک چیخ آسمان تھی اور ایک زمین تکلیف اس قیامت کی تھی کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ ہاتھ پاؤں دے دے بٹختی تھی۔ مگر کھولن کسی طرح کم نہ ہوتی تھی، وسیع دھن نے برابر میں دیکھا تو حفیظ پڑا تھا پنڈے پر ہاتھ رکھا تو بھلس رہا روشنی میں دیکھا تو نیلا کا بچ۔ پوچھا ”بیٹا“

یہ کیا ہوا، سنسن کے چمکارنے سے بچہ بلبلا اٹھا دوڑ کر لپٹا اور کہا: ”ابھی خالہ جان بچالو، نہیں بھول گیا۔ بیگم صاحب بچا بیٹے،“

سنسن ”بیگم صاحب کیسی میں تو تمہاری خالہ ہوں“

حفیظ ”نہیں بیوی جی نہیں اب نہیں کہوں گا“

”اتنا کہہ کر بچہ ماتھ جوڑ سنسن کے سامنے کھڑا ہو گیا، اور کہنے لگا

”بیوی جی اب نہیں کہوں گا بھول گیا تھا“

سنسن نے چمکار کر گود میں لیا اور کہا ”مادر کس نے ہے ارے کیا ہوا؟“

حفیظ اس کا جواب نہ دیتا تھا۔ گود میں اٹھا کر اپنے ہاں لائی۔ اس کے

چوٹ کاری لگی تھی اور ایسا سہما ہوا تھا، کہ ایک ایک سے کہتا تھا ”ٹھٹھا

کے لئے بچالو، اب نہ کہوں گا“

وسید دُلہن کی تکلیف لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی ایک آگ تھی کہ سر سے

پاؤں تک لگ رہی تھی اور تمام جسم بھٹنا جاتا تھا اسی حال میں بچہ کا خیال آیا

اور ہائے کر کے اسلاصر کی چیخیں مارنے لگی، اسی حالت میں نظر سلیم

پر پڑی، کہ قے کے ساتھ انٹریاں اور کلیجہ کٹ کٹ کر باہر آ رہے ہیں

کی نظریں چار ہوئیں، دونوں کی آنکھ میں آنسو آ گئے۔ سلیم نے صرخت مارتا کہا

اماں جان دودھ میں کیا نہر تھا، اور پھر بہوش ہو گیا،

”ہائے تو نے پی لیا!“ اٹھی ایک چنچ ماری اور یہ کہہ کر سلیم پر گر پڑی

اپنے ماتھ سے نہر دینے والی ما قربان! ذرا آنکھ تو کھول!“

(۱۴)

شب رات کے دو بجے ہو گئے کہ عاکشہ کے ساڑھے چار سال کے بعد

اس یتیم بچہ پر سکرات کی سی کیفیت طاری ہوئی سنسن اس کے سر ہانے

تھی۔ بچہ بے ہوش تھا۔ وقتنا چلایا اور یہ کہہ کر ”ارے کوئی بچاؤ اب نہیں
 کہوں گا، بے ہوش ہو گیا۔ اس دفعہ ناسترن کو یقین ہوا کہ بن ماکا بچہ میرے
 پاس حسد کی امانت تھا، جب تک میں نے محبت سے پالا میرے پاس
 رہا، اب مجھ سے کوئی غلطی ہوئی۔ اس لئے خدا اپنی امانت واپس لیتا
 ہے۔ اس یقین کے ساتھ ہی وہ بچہ کی طرف ٹھکی اور کہا ”حفیظ مسیاں
 خدمت گزار خالہ سے خفا ہو کر اس گھر سے رخصت ہوتے ہو۔ بید کی
 بدھیاں بخار زدہ جسم پر نہیں بد نصیب خالہ کے کلیجہ پر ہیں“ اتنے ہی میں
 برابر سے رونے کی آواز آئی عادت کو ادھر بٹھا ادھر گئی، تو وسیع دلہن
 ایک ایک کے آگے ہاتھ جوڑ رہی تھی کہ ”اللہ میرے جسم پر پانی ڈالے جاؤ“
 جوان شیر اس کے سامنے دم توڑ رہا تھا، کلیجہ پر گھونٹے مارتی تھی دیواروں
 سے سر پھوڑتی تھی اور چلاتی تھی ”ارے رحم کرو، سلیم کو بچاؤ،
 اس آگ کو بجھاؤ“ ناسترن پاس کھڑی رو رہی تھی، وسیع دلہن نے
 اس کی طرف دیکھا اور کہا،

اپنے بچوں کا صدقہ رحم کر

اتنا سنتے ہی ناسترن بے تاب ہو گئی، اور رو کر کہا ”آپ ہیگیم ہیں میں
 لونڈی ہوں، میری جان بھی کام آئے تو عذر نہیں، میں نے ڈاکٹر
 کو بلوایا ہے آپ صبر کیجئے آنا ہو گا“

اتنے میں ڈاکٹر بھی آگیا، سلیم کوٹنے کی اور وسیع دلہن کو میند
 کی دوا دی۔ سلیم متواتر قے کر رہا تھا اور جیتے خون کے تھتے کے تھتے
 نکل رہے تھے۔ وسیع دلہن کی اذیت دیکھی نہ جاتی تھی جسم سوج کر کٹا ہو گیا
 اور کچھ ایسا زہریلا مواد بھر گیا تھا کہ چمکوں اور ٹلیسوں نے جان پر بنا دی

تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آگ میں بھن رہی تھی، ادھر اپنی مصیبت ادھر اسلام کا خیال اور سامنے ایک لال کا دم واپسین ایک ایک کے آگے حسرت سے دیکھتی، منت سے ہاتھ جوڑتی اور کہتی تھی۔

”ارے لڑ بچاؤ،“

خدا خدا کر کے ذرا آنکھ لگی تو کیا دیکھتی ہے کہ بارہ سال کا بچھڑا ہوا وسیم جس نے آخر وقت بیوی کے چہرے پر وداعی نظر ڈال کر یہ درخواست کی تھی کہ ”سیتیم بچے تمہارے سپرد ہیں۔ ان کی تربیت میں غفلت نہ کرنا“ سامنے کھڑا ہے، ایک ہاتھ میں کشتی خوان پوشش سے ڈھکی ہے اور دوسرے ہاتھ میں چھری، برابر میں سلیم ترپ رہا ہے اور باپ سے کہہ رہا ہے کہ ”ابا جان انا جان نے مجھے دودھ میں زہر دیا“ وسیم جیسا کڑیل جوان جس کی پیشانی پر مرض الموت میں بھی بل نہ آیا اس وقت زار و قطار رو رہا ہے وسیم دہن سنائے میں رہ گئی بھاگنا چاہتی تھی کہ وسیم نے کہا۔

”ایک عورت کے ما بننے کا انجام اور بیوی ہونے کا نتیجہ جو کچھ نتجہ کم بخت کی ہستی سے برآمد ہوا۔ میں یا میرے ما باپ نہیں، تیرے باپ دادا اور پردادا کی روحیں اس سے فخر اڑی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس وقت اپنی بچھلی زندگی پر نظر ڈال، بیٹی تھی تو کیسی تھی، بیوی ہوئی اور ما رہی تو کیسی رہی۔ بھول منت وہ رات جب عاشق زار ماکو صرف اس قصور میں کہ کھڑکی میں کھڑا ہونے کو منع کیا تھا، کامل آدمہ گھنٹہ تو نے باتیں سنائیں۔ وہ رات گزر گئی وہ گھڑی نہ رہی، مگر تیرا سلوک تیرے اعمال نامے میں موجود ہے، امر گئی تو مر رہی ہے، لیکن

وہ ٹھیس جو مامتا کی ماری کے سبب دل کو تیری تیز زبان سے پہنچی ابھی زندہ اور محفوظ ہے۔ فراموش نہ کہ وہ دن جب شوہر، جو خدا سے مجازی تھا، بھوکا لقمہ دق کرتا کچری چلا گیا۔ اور تو کمزوری کا بہانہ کئے پلنگ پر پڑی رہی۔ اس کی بھوک اور تیرا مکر دونوں ختم ہو چکے، لیکن، مادر دنیا کا ہر کچھ، بچہ کا ہر سانس، سانس کا ہر عمل میکا رہ نہیں با کا، خالی نہیں کچھ معنی رکھتا ہے وقت گزرنے والا، کام رہنے والا، بات ہو چکے والی، لیکن اثر رہ جانے والا ہے۔ عادت آج بھوکا نہ ہو، لیکن اس کی بھوک تیرے اعمال نامے میں باقی رہے گی۔

عائشہ کا بچہ بن ماکا بن باپ کا، چار ساڑھے چار سال کا جس کے آنسو کا ہر قطرہ فرشتوں کا دل دہلانے والا جس کے دل کی ہر آہ عرش کا گنگورہ ہلا دینے والی تجھ سے مدد مانگے التجا کرے کہ سر میں بیٹی یا ندھ دو اور صرف خالہ کہنے پر وہ سنگین مار کھائے کہ درو دیوار تک کا نہیں اور تیرا دل نہیں سمجھے۔

کس برتے پر اے جفا کار، کس بھروسہ پر اس جسم پر گھمنڈ اور طاقت پر بھروسہ تھا؟ تو نے سادات کی آبرو پر پانی پھیرا یا پ دادا کی عزت خاک میں ملائی، آنکھ اکٹھا کر اوپر دیکھ آسمان سے زمین تک کائنات کا ہر ذرہ تجھ پر لعنت بھیج رہا ہے، اور انسانوں جس کو سو کن سمجھا، اور درزن جانا اور ہر نظر ڈال محسوس کا ہر انسان اور آسمان کی ہر مخلوق اس کا کلمہ پڑھ رہی ہے، پانچ اس کے در سے اور انڈیاں اس کے گھر سے بے اور جی رہے ہیں۔ اس کی جان اور مال کی، اس کے شوہر اور بچوں کی حفاظت وہ یتیم کر رہے ہیں جو ادھر دسترخوان سے پیٹ بھرتے ہیں اور ادھر خدا

شب زندگی حصہ اول ۱۲۷
از علامہ راشد الخیریؒ

کی سلطنت کے مالک ہیں۔

میرے دونوں کالج کے ٹکڑوں اسلام اور سلیم کا حشر جو تجہ ناہجار
ماکے ہاتھوں ہوا دنیا تیرے پیچھے اور ان کے بعد بھی اس کو یاد رکھے
گی تو ماؤں کے واسطے سبق بیویوں کے لئے نمونہ اور عورتوں کے لئے
عبرت ہوگی!

سلیم کا زہر تیری غلطی نہیں حفیظ کی آہ اور تیری اذیت بچہ کا کاٹا
نہیں فاروق کی بد دعا ہے، لیکن ابھی کچھ نہیں ہوا، یہ تہید ہے اس
عذاب کی جو نازل اور مصیبت کی جو برپا ہونے والی ہے۔

اپنی مصیبت کو رو چکی، اب رو اس لال کو جو تجہ بد بخت ماکے لبت
وطن سے ہزاروں کوس دور پانی کے ایک ایک قطرے کو ترستا دینا
سے رخصت ہو رہا ہے۔

اتنا کہہ کر وسیم نے خوان پوش اٹھایا اور اسلام کا سر ماکے گود
میں ڈال دیا۔ ایک چیخ ماری، ابھی آواز ختم نہ ہوئی تھی، کہ وسیم نے سلیم
کو گردن پکڑ کر اٹھایا اور بیوی سے کہا:

وہ جن آنکھوں نے بے بس فاروق کا خون ہنس ہنس کر جس دل نے کمزور
حفیظ کی مار کھل کھل کر دیکھا اور دیکھی وہ یہ تماشا بھی دیکھیں!

اب وسیم نے بچہ کو چٹ لٹایا، تیز چھری کی دھار چمکی اور آنا فانا باب
نے ماکے سامنے بچہ کو ذبح کر دیا۔ سلیم کے خون کی چھینٹیں ماکے کپڑوں پر پھیں
بلبلانی اور خواب ہی میں بے ہوش ہو گئی یہاں تک کہ عارف کی اس
آواز نے جو دسترن کے سوال کا جواب تھا، اس کو ہوشیار کیا:

”ہاں ہاں اسلام کی موت کا تار ہے“
اگست ۱۹۱۹ء

انتباہ و اطلاع

اس کتاب کا حق اشاعت ہمیشہ کے لئے محفوظ ہے۔ کوئی صاحب اس کتاب کو یا اس کے کسی حصہ کو شائع فرمانے کی جرأت نہ کریں ورنہ اخلاقی و قانونی جرم کے مرتکب ہونگے۔ اعلیٰ تاجران کتب معقول کمیشن پر جس قدر جلدیں چاہیں دفتر عصمت سے طلب کر سکتے ہیں۔

رازیق النجیری دفتر عصمت دہلی

شب زندگی حصہ دوم

شب زندگی حصہ اول دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ خدا نہ کرے کوئی عورت دوسرے دلہن جیسی ہو، لیکن حصہ دوم میں وہی وسیم دلہن نہایت نیک خدا ترس بیوی نظر آئے گی حصہ اول کی دوسری دلہن پیچھے ہے تو حصہ دوم کی ہیرا اور یہ زبردست انقلاب کس طرح ہوتا ہے۔ اور اس کے دونوں لالہ اس کے کلبجہ سے پھر کیونکر چمٹ جاتے ہیں یہ راز صرف حصہ دوم ہی سے معلوم ہوگا۔

حصہ دوم کی ہیرا ویں فاطمہ ہے جو بڑی سے بڑی سختیوں کا نہایت استقلال سے مقابلہ کرتی ہے۔ اور اپنی قربانیوں اور ایثار سے جو حیرت کر دیتی ہے اتنا دلکش پلاٹ ہے کہ کسی اردو کتاب میں اس سے قبل نہ دیکھا ہوگا یہی وہ معرکتہ الآرائضیف ہے جو علامہ محترم نے اپنی پہلی محترمہ خاتون اکرم مرحومہ رومنائی میں دی تھی۔ قیمت صرف ایک روپیہ (عمر)

حضرت علامہ مغفور کی کتابیں ملنے کا بہتر دفتر عصمت دہلی

مصوٰغم حضرت علامہ راشد انجیری علیہ الرحمۃ کی تصانیف

۸	سراب مغرب	۸	گلدستہ عید	۸	آمنہ کالال
۸	در شہوار	۴	گرفتارِ قفس	۴	سیدہ کالال
۸	سات روج کے اعمال	۱۰	رودادِ قفس	۱۲	الزہرا
۸	قرآنی قصے	۶	انگوٹھی کا راز	۴	عروسِ کربلا
۲	عروسِ مشرق	۵	تفسیر عصمت	۵	وداعِ خاتون
۱۰	بزمِ رفنگانِ بالقصیر	۵	منظرِ طربس	۸	شامِ زندگی
۴	گدڑی میں لال	۴	منازلِ ترقی	۴	صبحِ زندگی
۱۱	نالہ زار	۴	سیلابِ اشک (بالقصیر)	۱۲	نوحِ زندگی
۴	پرہیزِ فکری کا آخری دن	۴	جوہرِ عصمت	۸	شبِ زندگی دو حصے
۸	سیاحتِ ہند	۱۰	غافلِ عشق	۱۲	محبوبِ خداوند
۸	گردِ آبِ حیات	۴	طوفانِ اشک	۸	نسوانی زندگی
۸	دادِ لال بھجوا	۵	سودائے نقد	۸	طوفانِ حیات
۸	احکامِ نسواں	۶	دلالتِ نفی	۴	حیاتِ صالحہ
۶	محسنِ حقیقی	۸	بنتِ الوقت	۱۲	تعمہ شیطانی
۶	مسلمی ہوئی بنیاں	۸	منازلِ السائرہ دو حصے	۴	جوہرِ قدامت
۱۲	داستانِ پارسیہ بالقصیر	۱۲	بچہ کا کرتہ	۴	یاسمینِ شام
۸	وعائیں	۴	ابنِ کادم والپسین	۸	اموودہ
۸	چمنستانِ مغرب	۴	شہنشاہِ کافیلہ	۱۲	غدر کی ماری شہزادیاں
۱۰	بلبلِ بہار	۴	ویڈیا کی سرگزشت	۸	ستونِ حق
۶	یا وگارِ تمدن	۸	فسانہِ سعید	۸	قلبِ حزین
۸	دلی کی آخری بہار	۴	چہار عالم	۴	وداعِ ظفر بالقصیر
۱۲	جورادِ انسان	۸	شہیدِ مغرب	۸	شیخِ کمال
۱۲	نشیب و فراز	۸	محمولِ ڈاک بزمِ شہید	۸	بساطِ حیات

حضرت علامہ مصوٰغم راشد انجیری علیہ الرحمۃ کے سلاب کی اینٹیں اور دو کتب و غیر عصمت دہلی سے شائع ہوئی ہیں۔

موصوع جعفر علاء الدین کی تصانیف لکھنؤ اور عورتوں کیلئے پیش کتابیں

۸	قرب حریف	۸	آئینہ کمال
۸	گلدستہ شیدہ	۸	سیدہ کمال عالم
۱۲	دوداد قفس	۱۲	الزہراء
۱۳	گرفتار قفس	۱۳	امت کی باتیں
۱۵	تفسیر عصمت	۱۶	دربار خاتون
۸	انگوٹھی کا راز	۱۶	صبح زندگی
۱۳	منازل ترقی	۱۶	شام زندگی
۱۶	جوہر عصمت	۱۶	شب زندگی
۱۶	سیلاب تلک	۱۶	نوحہ زندگی
۱۶	طوفان آشک	۱۶	بنوائی زندگی
۱۰	نانی عشو	۱۶	جہانیت صالحہ
۱۶	ولایتی نغمی	۱۶	طوفان جہات
۱۶	منازل السارہ	۱۶	جوہر قدامت
۱۶	بنت الوقت	۱۶	متذہب طافی
۱۶	ابن کادوم واپس	۱۶	مؤدہ
۱۶	بچہ کا کرتہ	۱۶	ستون
۱۶	دیہاتی سرگشت	۱۶	غیر کی لڑی شہزادیاں
۱۶	خانہ سیدہ ہوسرت غیب	۱۶	دربار ظفر
۱۶	اسکا لڑی خانہ خاں کی طرز پر	۱۶	عروس کر بلا
۱۶	تفصیل کمال	۱۶	محبوبہ پند
۱۶	اندلس کی شہزادی	۱۶	یاسمین شام
۱۵	سودا لائقہ	۱۶	شہنشاہ کا فیصلہ
۱۶	شہید مغرب	۱۶	منظر طرابلس
۱۵	سات دھڑ کا لکنا	۱۶	دربار شہوار
۱۶	عصود اکبر خدیو	۱۶	

شریفیات کیلئے اعلیٰ درجہ کی کتابیں کھانے پکانے کی کتابیں

جن کی تیاری میں ہندوستان کے ہر حصہ کی تقریباً ۱۵۰ مغز خواتین حصہ لیا ہے جن کی تمام ترکیبیں تحریر کر لی گئی ہیں اور جن سے زیادہ صحت مند مفصل وکل کوئی کتاب آج تک ہندوستان میں نہیں چھپی۔

عصمتی دسترخوان عام	شرقی مغربی کھانے کا	بچوں کے کھانے
بیماروں کے کھانے	عصمتی ہند کھانا	مذاق کھانے ہر ناشا

دستکاری کی کتابیں

جو اپنے اپنے موضوع پر نہایت مفید اور کامیاب کتابیں تسلیم کی گئی

عصمتی کر دشتیا	عصمتی کشیدہ	گلدستہ کشیدہ
موتیوں کا کام	سلسلہ کار کام	خاتین کی دستکاریا

تصانیف فخر نسوان ہندوستان خاتون اگر کم
جو زمانہ لڑکی کی چوٹی کی کتابیں ہیں جن پر ملک کے شہزادیاں اور
نہایت شاندار رویوں کے ہیں جن کے بغیر کوئی زمانہ کتب خانہ مکمل
کہا جاسکتا۔ آرٹ کا فن چھپی ہیں۔

جہان شناس	گلستان خاتون	پیکر دھار	بچھڑی سید
-----------	--------------	-----------	-----------

مغز خواتین کے لکھے ہوئے دستکپ اور بہت آموزہ صلاحتی و صلاحتی
نادر انسانی وغیرہ جن میں لکھ

اور عورتوں کو نہایت مفید باتیں بتائی گئی ہیں۔

اوری بیگم	دولت پر قربانیاں	ہنسی کی باتیں
مشیر نسوان	خاتین اندلس	تاریخی لطیفے
سرگشت ہجرہ	تندرتی ہر رفت	بچوں کی تربیت
سودھنی	شع خاتون	بچوں کی دنیا
غیرت کی تہلی	تحریر النساء	نقشہ دنیا
چار رخ	عقل کی باتیں	آئینہ موثر

مصلحت کا پتہ میسر سالہ عصمت و صلی
مصلحت کا پتہ میسر سالہ عصمت و صلی

CALL No. ۸۹۱۵۴۳۳ ACC. NO. ۳۲۱
 AUTHOR دانشا الخیری
 TITLE شب زنی - حقیقت

۸۹۱۵۴۳۳ ۳۲۱
 شب زنی - حقیقت

Date	No.	Date	No.	No.
11/3/07	8882			



MAULANA AZAD LIBRARY ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY

RULES:—

1. The book must be returned on the date stamped above.
2. A fine of Re. 1.00 per volume per day shall be charged for text-books and 10 Paise per volume per day for general books kept over-due.

4